اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۰۷)

# اقبال ریویو

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا!
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!

## خصوصی پیش کش

مولانا جلال الدین رومی کے ۸۰۰ ویں سال پیدائش کے موقع پر

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان
(اپریل ۲۰۰۷ء)

# اقبال ریویو

## خصوصی پیش کش

مولانا جلال الدین رومی کے ۸۰۰ ویں سال
پیدائش کے موقع پر

جلد (۱۶) شمارہ (۱)

ISBN 81-86370-34-1

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

## مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

## مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اکیڈیمی)

۲۔ سید امتیاز الدین۔ ایڈیٹر
(معتمد اکیڈیمی و ایڈیٹر)


## بدل اشتراک

فی شمارہ ۵۰ روپے
ایک سال (دو شمارے) ۹۰ روپے
بیرونی ملک فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم


خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔ حیدرآباد۔ 500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔ فون: 66663950

e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین، محمد عبدالحمید ''شارپ کمپیوٹر'' محبوب بازار، چادر گھاٹ، حیدرآباد۔ ۲۔ فون: 9392427796

Sharp Computers

Mahboob Bazar Complex, Chader Ghat, Hyd.

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے وی جی پرنٹرز دلسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

# فہرست


| عنوان | مضمون نگار | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| ۱۔ اداریہ | سید امتیاز الدین | ۵ |
| ۲۔ مطالعہ رومی میں اقبال کا مقام | ڈاکٹر سید عبداللہ | ۷ |
| ۳۔ رومی اور اقبال | ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم | ۱۸ |
| ۴۔ اقبال اور مولانا رومی | ڈاکٹر محمد علی صدیقی | ۲۷ |
| ۵۔ مولانا روم | ڈاکٹر منظر اعجاز | ۳۵ |
| ۶۔ اقبال اور رومی | نذیر مومن | ۴۸ |


## متفرقات


| | | |
|---|---|---|
| ۸۔ یادداشت | مولانا رضوان القاسمی | ۵۹ |
| ۹۔ پروفیسر سید سراج الدین۔ چند یادیں چند باتیں | بشیر احمد نحوی | ۶۲ |
| ۱۰۔ خبرنامہ | ادارہ | ۶۸ |


انگریزی سیکشن

○○○○

زِ رومی گیر اسرارِ فقیری
کہ آں فقراست محسودِ امیری
حذر زاں فقرودرویشی کہ ازوے
رسیدی بر مقامِ سر بزیری
(ارمغان حجاز)

ترجمہ

سمجھ رومی سے اسرارِ فقیری
کہ ہے وہ فقر محسودِ امیری
حذر اس فقرودرویشی سے جس نے
دکھایا ہے مقام سربزیری
(مضطر مجاز)

# اداریہ

اقبال ریویو کی ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ اس کا ہر شمارہ اپنے مضامین کے اعتبار سے معلومات افزا بھی ہو اور اقبال پر تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک یادگار تحفہ بھی ثابت ہو۔ مولانا رومی کی پیدائش کو اس سال آٹھ سو برس مکمل ہوتے ہیں۔ علمی حلقوں میں اس سال کو مولانا رومی کے سال سے منسوب کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے خود کو پیر رومی کے مرید کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اقبال کے کلام پر مولانا روم کے اثرات کتنے زیادہ ہیں یہ ہر اقبال شناس جانتا ہے۔ جاوید نامہ جو اقبال کی زندگی کا حاصل ہے رومی کے فیض سے مستفاد ہے۔ سیر افلاک میں رومی اقبال کے ہمسفر بھی ہیں اور رہنما بھی۔ اقبال کہتے ہیں:

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

اس شمارے میں ہم نے مختلف کتب و جرائد سے رومی اور اقبال پر مستند اقبال شناسوں کے مضامین یکجا کئے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر منظر اعجاز اور نذیر مومن کے مضامین اقبال اور رومی کے باہمی فکری اور معنوی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اقبال جیسی عالمگیر شخصیت کے نام سے جو رسالہ شائع ہو وہ اگر صرف اردو تک محدود ہو کر رہ جائے تو عالمی سطح پر اس کی صحیح معنی میں پذیرائی نہیں ہو سکتی اس لئے اس رسالے کا ایک حصہ انگریزی میں بھی شائع کر رہے ہیں۔ مولانا روم پر سوانحی نوعیت کے مضامین انگریزی میں بھی شامل کئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے نوجوان قارئین کو انہی مضامین سے رومی کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہونگی۔

عمر قاضی صاحب کیرالا کے اٹھارویں صدی کے ایک صوفی شاعر تھے۔ علامہ اقبال اور عمر قاضی کے عنوان سے ایک انگریزی مضمون بھی شریک اشاعت ہے۔ یہ مضمون ایک ہونہار

نوجوان جناب مجیب الرحمٰن جیحون نے تحریر کیا ہے۔صدر اقبال اکیڈیمی نے جیحون کی انگریزی میں ایک قابل قدر کتاب پر پیش لفظ لکھا تھا جو اس شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کے ڈائرکٹر جناب بشیر احمد نحوی صاحب کا مضمون ''پروفیسر سید سراج الدین چند یادیں' چند باتیں'' پروفیسر سراج الدین نمبر کی اشاعت کے بعد ہمیں ملا۔اس مضمون کی اثر آفرینی اور جذبہ اخلاص کی بنا پر اسے اس بار شامل کیا گیا ہے اس مضمون سے پروفیسر سراج الدین صاحب کے قیام کشمیر کی یادیں بھی تازہ ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا رضوان القاسمی مرحوم کا ایک مختصر مضمون بھی شائع کیا جارہا ہے جو موصوف نے ''میر عرب ﷺ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے'' کے پس منظر کے بارے میں تحریر فرمایا تھا۔

ممتاز شاعر اور مترجم کلامِ اقبال جناب مضطر مجاز نے زیر نظر مقالوں کے فارسی اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔اس گراں قدر تعاون کے لئے ادارہ موصوف کا ممنون ہے۔

اقبال ریویو کے اس شمارے کے بارے میں اپنی رائے سے ہمیں نوازیں۔اس علمی جریدے کو آپ کی سرپرستی کی ضرورت ہے تاکہ اس کی اشاعت میں اضافہ ہو۔ہماری تمنا ہے کہ دنیا بھر میں جہاں جہاں اقبال کے چاہنے والے ہیں۔وہاں اقبال ریویو کا شمارہ پہنچے تاکہ اقبال کے کلام کو ہر خاص و عام تک پہنچانے کی ہماری کوشش کامیاب ہو۔

(سید امتیاز الدین)

○○○○

ڈاکٹر سید عبداللہ

# مطالعۂ رومی میں اقبالؒ کا مقام

مطالعہ اقبال کے سلسلے میں رومی کو جو اہمیت حاصل ہے اسکا اعادہ لا حاصل ہے کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کو اقبال کے معمولی سے معمولی ناقد یا شارح نے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مگر مطالعہ رومی کے سلسلے میں اقبال کو جو اہمیت حاصل ہے' اس کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہ موضوع بذاتِ خود اہم ہونے کے علاوہ اقبال اور رومی دونوں کے تقابلی مقام کو سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس خیال کے تحت میں نے اس مضمون میں مطالعہ رومی کی تحریک کا عہد بہ عہد مگر مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف ادوار میں رومی کے اثرات و فیوض کا سراغ لگایا جائے۔ اور یہ بھی کہ رومی کو تاریخ افکار میں جو رتبہ اقبال نے دلایا ہے اور ان کے معارف و اسرار کو جس طرح علوم ثابتہ کی روشنی میں بے نقاب کیا ہے اس کا صحیح صحیح اعتراف کیا جا سکے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا شاید غلط نہیں کہ اگر رومی نے اقبال کی فکر کو چار چاند لگائے ہیں تو اقبال نے بھی رومی کے افکارِ عالیہ کو بڑی عقیدت سے دنیا میں متعارف کرایا ہے۔ جس سے ان کے رتبہ و مقام کو پہلے سے کہیں زیادہ سربلندی نصیب ہوئی۔ یہ اقبال کی سعادت مندی ہے کہ وہ رومی کی غائبانہ شاگردی سے مفتخر ہوئے۔ مگر یہ فکر رومی کی بھی خوش نصیبی ہے کہ اس کو اقبال جیسا ہوشمند اور بالغ نظر شارح ملا۔ جس نے اپنے نامور استاد کی عظمت کے مینار اور اونچے کر دیئے اور ان کی شہرت کو فلک الافلاک تک پہنچا دیا۔ چنانچہ مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے لے کر آج تک جتنے علما و فضلا نے افکار رومی کا تجزیہ کیا ہے ان میں شاید اقبال ہی مثنوی کے وہ واحد ترجمان ہیں جن کی توجیہات نے مثنوی کو ایک سائنسی فکر اور مثبت و پائیدار اقدارِ زندگی کا حامل ثابت کیا اور ان کی حکمتوں کو دریافت کیا ہے جن سے کائنات اور حیات کے ارتقاء و تکمیل کے بڑے بڑے راز دریافت ہوئے ہیں۔ مطالعۂ رومی کے سلسلے میں اقبال کی یہ اہمیت جب ہی ثابت کی جا سکتی ہے کہ

ہم پہلے مثنوی کے تنقید نگاروں یا عالموں کے کام پر نظر ڈال کر یہ واضح کر دیں کہ اقبال سے پہلے رومی کے مطالعہ کی نوعیت جزوی اور انفرادی سی تھی۔ یہ اقبال ہی تھے جن کے طفیل رومی کے افکار کی وہ تشریح ہوئی جس سے وہ حیاتِ اجتماعی اور ارتقائے انسانی کے ایک بڑے ترجمان اور محرم اسرار ثابت ہوئے۔

مولانا روم کا انتقال ۱۲۷۳ء/۶۷۲ھ میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد آج تک تقریباً سات سو سال کا عرصہ گزرا ہے۔ اس طویل مدت میں تقریباً ہر دور میں مثنوی پر کام کرنے والے بیسیوں[1] کی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ جو مثنوی کی مقبولیت کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اس معاملہ میں اگر مثنوی کے مقابلے پر فارسی کی کوئی اور کتاب لائی جاسکتی ہے تو وہ دیوان حافظ ہے۔ مگر دیوان حافظ کی حیثیت محض شعر و معرفت کی کتاب کی ہے۔ مثنوی ان دونوں حیثیتوں کے علاوہ اسرارِ دین اور علم کلام کی کتاب بھی ہے۔ اس وجہ سے ایران و خراسان بلکہ ترکی اور پاک و ہند میں بھی مثنوی کو ایک مقدس اور الہامی کتاب کا درجہ حاصل رہا ہے۔ چنانچہ یہ مشہور مصرع ؎

ہست قرآن در زبانِ پہلوی

(فارسی زبان میں قرآن ہے)

اسی حقیقت کا اعلان کر رہا ہے۔ غرض مثنوئ رومی ادبیاتِ فارسی کی مقبول ترین کتاب ہے۔ جس کا ثبوت اس بات سے بھی مہیا ہوتا ہے کہ اس کی لاتعداد شرحیں، ترجمے اور فرہنگ لکھے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض کی اپنی علمی سطح بھی اتنی بلند ہے کہ ان کو بذاتِ خود ادبیاتِ عالیہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

رومی کے مطالعہ و تتبع کی تحریک خود رومی کی زندگی ہی میں شروع ہو چکی تھی ان کے بعد ان کے فرزند سلطان ولد نے حباب نامہ کے نام سے ایک مثنوی لکھی جسمیں اپنے والد بزرگوار کی مثنوی کا تتبع کیا۔ سلطان ولد کی مثنوی الدی کے دیباچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد 'مولانائے

---

[1] مثنوی کی شرحوں، ترجموں، انتخابوں کا ذکر جن میں عربی، فارسی، ترکی اور مغرب کی زبانوں کی سب تصنیفات شامل ہیں۔ بانکی پور لائبریری کی فہرست مخطوطات ج ۱۰ ص ۵ نیز حاجی خلیفہ کشف الظنون ج ۵، ۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔

روم' کی مثنوی بہت جلد ان کے متبعین میں مقبول ہوگئی تھی اور کثرت مطالعہ و تفاوت کے سبب اس کا اسلوب اور وزن و بحر بھی اس قدر خاطر نشین ہو گیا تھا کہ مثنوی نگاری کے لئے (خصوصاً صوفیانہ مطالبات کے سلسلے میں) کوئی دوسرا اسلوب لوگوں کو پسند ہی نہ آتا تھا۔

براں وزن از خواندانِ بسیار خوکردہ اند وایں وزن در طبع شاں نشستہ است

مثنوی رومی کے مطالعے کی لہر نویں صدی ہجری کے آغاز میں اور بھی تیز ہوگئی۔ حُسین خوارزمی اسی زمانے کے ایک مصنف ہیں جن کی شرح مثنوی (جواہر الاسرار کے نام سے) ۸۳۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ دسویں صدی ہجری میں مثنوی رومی عام مطالعہ کے علاوہ نصاب درس و تدریس میں بھی شامل ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران و خراسان میں اس کی مشکلات کو سمجھنے اور سمجھانے کی خاصی کوششیں ظہور میں آتی ہیں۔ اس تدریسی رجحان کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ مثنوی کے اسرار و معارف کی پردہ کشائی کے بجائے اس کی لفظی مشکلات کی طرف زیادہ توجہ ہونے لگی اس زمانے میں علامہ داعی شیرازی (متوفی ۹۱۵ھ) کی شرح اور شاہدی کا انتخاب گلشنِ توحید (تصنیف ۹۳۷ھ) متوفی اور سرور ۹۶۹ھ کی شرح مثنوی قابل ذکر ہیں۔ ان شرحوں میں صرف داعی شیرازی کا انداز تدوین اس قسم کا ہے کہ اس سے لفظی فرہنگ نویسی کے علاوہ مثنوی کے معارف کی بھی کچھ راہنمائی اور نقاب کشائی ہوتی ہے۔ یہ داعی حضرت شاہ نعمت اللہ کے ہوست تھے۔ اور ان کی رفاقت میں انہوں نے عمر کا ایک حصہ زہد و عبادت میں بھی گزارا تھا۔ چنانچہ ان کی اس زاہدانہ زندگی کا اثر ان کے مطالعات میں بھی نظر آتا ہے۔ اور اس کے واضح نقوش ان کی اس شرح میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر داعی کی شرح محض تدریسی یا محض زاہدانہ رنگ کی نہیں۔ اس میں فکر کی برجستگی بھی کسی حد تک ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے افکار میں تصوف اور زہد کا رنگ شوخ ہے۔

دسویں صدی کے آخر اور گیارھویں صدی کے شروع میں رومی کی مثنوی ہندوستان میں بھی باقاعدہ طور پر درس و تدریس میں شامل ہو جاتی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا دورِ عقلیت مثنوی کی عرفانی اور وجدانی روح کا متحمل نہ تھا۔ اس لئے بظاہر مثنوی رومی اکبر کے زمانے کے اہم مطالعات کے دائرہ میں جگہ نہیں پاسکی اور تعجب تو یہ ہے کہ اس زمانے کا شاید سب سے باشعور مصنف ابوالفضل جو عقل کے تصرّفات کا قائل ہوتے ہوئے عرفان اور وجدان کی برکتوں کا بھی معترف تھا ایک موقع پر مثنوی کے کمیاب ہونے کی شکایت کرتا ہے۔ وہ جلال الدین اکبر کے

ساتھ میدان پگھلی سے گزر رہا ہے اور فرصت کے اوقات کو کسی علمی مشغلہ میں گزارنا چاہتا ہے ۔اور اس وقت اس کی طبیعت مطالعہ مثنوی کی طرف مائل ہے ۔مگر بدقسمتی سے اسے اس گردونواح میں مثنوی کا کوئی مکمل نسخہ نہیں ملتا۔اس لئے ناچار ابوبکر شاشی کے انتخاب مثنوی ہی سے کام چلاتا ہے اور اس سے اپنے ذوق وحال کے مطابق اشعار کا انتخاب کر لیتا ہے۔اس سے یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں (کم از کم اس گردونواح میں) مثنوی رومی شاید وقت کی مقبول ترین کتابوں میں نہ تھی ۔بظاہر یہ بات تعجب خیز ہے مگر یہ دیکھ کر کہ مثنوی کا مزاج ایک خاص نفسی کیفیت اور اجتماعی شعور کا مطالبہ کرتا ہے اور بعض خاص ادوار میں اس کے مطالعہ کی طلب اور ادوار کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔اس صورتِ حال پر کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوتا کہ اکبری دور میں مثنوی کا چرچا کیوں کم ہو گیا تھا تاہم اکبری اور خصوصاً جہانگیری عہد اس معاملے میں بالکل کورا بھی نہیں اور آنے والے ادوار میں تو مثنوی کا ذوق اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ ہر طرف اس کے شارح اور فرہنگ نویس بہ تعداد کثیر نکل آتے ہیں ۔چنانچہ گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان اور ایران میں لکھی ہوئی شروحِ مثنوی کی فہرست خاصی طویل ہے ۔ان میں عبدالفتاح المعانی (۱۰۴۹ھ) عبداللطیف عباسی (متوفی ۱۰۴۸ھ) کی لطائف المعنوی' محمد رضا کی مکاشفات رضوی (تصنیف ۱۰۸۴ھ) اور شرح شاہ عبدالفتاح (متوفی ۱۰۹۰ھ) چند قابل ذکر کتابیں ہیں۔

عبداللطیف عباسی کی کتاب معارف المعنوی مثنوی کی مکمل شرح نہیں ۔کیونکہ عباسی نے صرف مشکل اشعار کی شرح کی ہے۔جس میں عربی عبارتوں اور قرآن مجید کی آیتوں کا ترجمہ بھی ہے۔عبداللطیف عباسی عہد شاہ جہانی کے بزرگ تھے۔انہوں نے عمر کا بیشتر حصہ مثنوی کے مطالعہ میں صرف کیا اور اس کے مشکل الفاظ کا فرہنگ بھی مرتب کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے آخری زمانے میں مطالعہ مثنوی کی تحریک پہلے سے زیادہ زور سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اس میں اتنی شدت اور وسعت پیدا ہوگئی کہ اورنگ زیب کے زمانے میں مثنوی ہی وقت کی محبوب ترین کتاب بن جاتی ہے ۔اس کی بے شمار شرحیں لکھی جاتی ہیں' ترجمے ہوتے ہیں اور انتخابات تیار کئے جاتے ہیں ۔اس کے علاوہ درس میں اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے ۔اس کے اشعار مجالس اور محافل میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس سے واعظ اور خطیب تذکرہ وتلقین کا کام لینے لگتے ہیں ۔غرض اس زمانے میں

اس کو نہایت ہمہ گیر مقبولیت ملتی ہے۔ اور عام و خاص سب اس کے مطالعہ سے لطف و سعادت حاصل کرتے ہیں۔

عہد عالمگیری کے مثنوی شناسوں میں دو اہم شخص ایسے تھے جن کی مثنوی دانی کی اس عہد کے مورخوں نے بڑی تعریف کی ہے۔ ان میں سے ایک عاقل خان رازی (میر عسکری) تھے جو اس زمانے کے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں شمار کئے جاتے تھے اور دوسرے انہیں کے داماد سید شکر اللہ خان خاکسار تھے جن کی شرح مثنوی خاصی شہرت رکھتی ہے۔ عاقل خان رازی کے متعلق مآثر امراء میں لکھا ہے۔

'در حلِ تدقیقاتِ مثنویٔ مولائے روم خود را یگانہ می دانست!'

اور نواب شکر اللہ خان کے متعلق شیر خاں لودھی نے مرأۃ الخیال میں ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ:۔

'کمترین شاگردانش بہ مثنوی دانی معروف و ادنیٰ تلمیذش بصفاتِ صوفیہ موصوف!'

ان خوش ذوق امرائے عہد کی بدولت مثنوی کے مطالعہ کا شوق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اور اس کے بعد مثنوی کا علم' شائستگی اور اوصافِ مجلسی کا لازمی عنصر بن جاتا ہے۔ جس کے زیر اثر شرحوں اور فرہنگوں کا سلسلہ بدستور قائم رہتا ہے۔ اس موقع پر اس عہد کی ان سب کتابوں کا تذکرہ جو مثنوی سے متعلق ہیں دشوار بھی ہے اور بے ضرورت بھی۔ البتہ ان میں سے سب سے قابل ذکر کتابوں کے نام لکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً محمد عابد کی الغنی (۱۱۰۰ھ) شاہ افضل الہٰ آبادی کی 'حل مثنوی' (۱۱۰۴ھ) شکر اللہ خان کی شرح مثنوی' خواجہ ایوب پارسالاہوری کی شرح مثنوی (۱۱۲۰ھ) ولی محمد اکبر آبادی کی مخزن الاسرار (۱۱۴۹ھ) خلیفہ خویشگی قصوری کی 'اسرار مثنوی' وغیرہ ان سب کے آخر میں ملا عبد العلی بحر العلوم (متوفی ۱۸۱۹ء/۱۲۳۵ھ) کی شرح مثنوی آتی ہے جس پر مطالعہ مثنوی کا پچھلا دور ختم ہو جاتا ہے اور کچھ دیر کے بعد نئے حالات کے تحت مثنوی سے استفادہ کی جدید (اور کئی معنوں میں پچھلی تحریکوں سے مختلف) تحریک پیدا ہوتی ہے۔

اس تحریک کا آغاز شبلی نعمانی کی کتاب 'سوانح مولانا روم' سے ہوا جس کی اشاعت سے حکمتِ رومی کا (جدید زمانے میں) پہلا علمی تعارف ہوا۔ اس علمی تعارف سے مطالعۂ رومی کی شاہراہیں بہت کشادہ ہوئیں۔ مگر اس اثنا میں قدرت نے ایک اور دانائے راز ایسا پیدا کیا جس

نے مثنوی کو ایک نئے عصر کی تخلیق کا وسیلہ اور ایک نئی زندگی کی تشکیل کا ذریعہ بنا کر اس کو مستقبل کی 'عصر آفریں کتاب' بنا دیا۔

مطالعہ مثنوی کی اس طویل تاریخ میں کم وبیش پانچ اہم سنگ میل ہمارے سامنے آتے ہیں:۔ اوّل خوارزمی کی 'جواہرالاسرار' جو ۸۴۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ دوم عبداللطیف عباسی کی تصنیفات جو شاہجہاں کے زمانے سے متعلق ہیں۔ سوم ملا بحرالعلوم (متوفی ۱۸۱۹ء/۱۲۳۵ھ) کی شرح مثنوی۔ چہارم شبلی کی سوانح مولانا روم۔ پانچواں اقبال کا استفادۂ رومی۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعۂ رومی کے یہ پانچوں سنگ میل تاریخ اسلامی کے نہایت پر اضطراب زمانوں سے متعلق ہیں اور یوں مثنوی خود بھی ایک ایسے پر آشوب زمانے کی یادگار ہے جس میں خدا پر ایمان و یقین اور انسان پر اعتقاد و اعتماد حملۂ تاتار کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا۔ اور یہ ایک ایسا قیامت خیز واقعہ تھا جس نے تہذیب کے پچھلے نقوش کو تقریباً مٹا دیا تھا۔ گویا رومی کی تصنیف کا زمانہ ایک خلا اور ابہام کا زمانہ تھا۔ جس میں روحیں کسی نئی منزل کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں اور ذہن انسانی کسی نئی دنیا کی جستجو میں آوارہ و سرگرداں تھا۔ ایسے روحانی انتشار اور ذہنی خلفشار کے زمانے میں مثنوی ظہور میں آئی۔ اس میں وہ جذب و سرور، وہ وجد و حال اور وہ بیخودی و مستی تھی جس کی اس زمانے کی پریشان و سرگرداں روحوں کو ضرورت تھی۔ کیونکہ لوگ عام طور سے خدا، انسان اور کائنات تینوں کا اعتقاد کھو بیٹھے تھے۔ ایسی حالت میں رومی نے جب اپنا نغمہ عشق سنایا تو اس سے اعتقاد کی بجھی ہوئی چنگاریوں میں پھر گرمی پیدا ہوئی اور حیات نے اپنی بکھری ہوئی کڑیوں کو پھر سے جوڑا۔ غرض مثنوی کے پیغام اور اس کے بیان کی یہ مسلم خصوصیت معلوم ہوتی ہے کہ اس سے بے یقینی، جمود اور روحانی بے اعتقادی کے ہر زمانے میں احیائے جدید کا کام لیا گیا۔ جس کا سبب یہ ہے کہ رومی کے کلام میں ڈھارس بندھانے اور امید پیدا کرنے کی خاص صلاحیت پائی جاتی ہے۔ لہذا جب بھی روح کو امید کے آب بقاء کی ضرورت ہوئی ہے رومی کے فیضان عام ہی سے اس کی پیاس بجھائی گئی ہے۔

حملۂ تاتار کی طرح تیمور کی ترکتازیوں کا زمانہ بھی انسانی شرافتوں کے لحاظ سے تاریکی کا زمانہ تھا۔ اس کی ظلمتوں میں خوارزمی نے پھر رومی کی شمع جلائی۔ اسی طرح ہندوستان میں اکبر کا زمانہ اگرچہ سیاسی عروج کا زمانہ تھا۔ مگر عقلیت نے وجدان و یقین کے سرچشمے خشک کر دیئے تھے۔ جہانگیر

کے عہد میں رومانیت کی ایک لہر ضرور پیدا ہوئی جس میں مقبول ترین ادبی ہیرو حافظ بنے۔ مگر یہ رومانیت لذت اندوزی اور روبہ انحطاط مسرت کوشی میں اعتقاد رکھتی تھی۔ اس لئے روحانی تسکین کیلئے کسی اور آبِ زندگی کی ضرورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں پھر مثنوی کا غلغلہ بلند ہوا۔ جس نے سکون و تسکین کے سامان پیدا کئے۔ غرض ہر زمانہ زوال میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد رومی کی طلب ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آ گیا جس میں اقبال نے دنیا کے سامنے رومی کے پیغام کی نئی تعبیر پیش کی۔

مثنوی کے زمانہ تصنیف سے لے کر آج تک اس کے مطالعہ کے چار مختلف مطمحِ نظر اور مقصد نظر آتے ہیں:۔ اوّل زبان کی مشکلات کے نقطہ نظر سے مطالعہ۔ دوم صوفیانہ اسرار و معارف کے نقطہ نظر سے، سوم علم و ادب کے نقطہ نظر سے، چہارم علومِ اجتماعیہ اور فلسفہ و حکمت کے نقطہ نظر سے۔ بعض صورتوں میں پہلا اور دوسرا نقطۂ نظر ملا جلا سامنے نظر آتا ہے۔ پرانے زمانے کے اکثر شارح اور مفسر مثنوی کو عموماً اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے رہے۔ ان میں سے تصوف اور عرفان کے نقطۂ نظر سے خوارزمی نے مثنوی کی نئی تعبیر و توجیہ کی۔ داعی شیرازی نے بھی کسی حد تک اسی حیثیت سے مطالعہ کیا۔

عبداللطیف عباسی نے زیادہ تر زبان و بیان کی مشکلات کی طرف توجہ کی۔ ہندوستان میں شاید علامہ ابوالفضل پہلے شخص تھے جنہوں نے مثنوی کے مطالعہ کے لئے دانش رسمی اور عرفان دونوں کی اہمیت پر زور دیا۔ مگر ابوالفضل کا مطمحِ نظر بھی فرد کی روحانی اصلاح و تہذیب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ مغلوں کے آخری دور میں مثنوی کا عام مطالعہ دراصل روحانی سکون و تسکین کے خیال سے ہوتا رہا۔ اور یہ اس ذہنی و روحانی انتشار کے خلاف ایک نسخۂ شفا تھا۔ جس سے طبائع کو عارضی طور پر مسرت اور تفریح مل جاتی تھی۔

مطالعۂ مثنوی کی تاریخ میں اقبال سے پہلے شاید سب سے بڑا نام مُلا بحرالعلوم کا ہے۔ جن کی طویل و ضخیم شرح مثنوی نہ صرف مثنوی کی مبسوط ترین تفسیر ہے بلکہ اس کا درجہ فارسی تصوف اور علم کلام میں بھی بہت بلند ہے۔ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اس نامور خاندان کے ایک فرد ہیں جس کو اسلامی ہندوستان کے دورِ آخر میں احیائے علومِ عربیہ کی تحریک کا بانی اور علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ بحرالعلوم کے والد مولانا نظام الدین سہالوی (انتقال ۱۱۶۱ھ) نے درس نظامیہ کی بنیاد

رکھی اور فلسفہ حکمت پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ بحر العلوم تجدید واحیاء کے لحاظ سے موروثی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے والد کی طرح حکمت، منطق اور علم کلام وغیرہ میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے مثنوی کو علم کلام اور محی الدین ابن عربی کے متصوفانہ نقطہ نظر سے پڑھا اور اس کی ایسی شرح لکھی جس میں فتوحاتِ مکیہ کا پورا پورا رنگ منعکس ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شرح معارفِ دین سے کہیں زیادہ معارفِ طریقت کی کتاب بن گئی ہے۔ اور یہی اس کی خصوصیت ہے۔ مطالعہ مثنوی کے سلسلے میں شبلی کی یہ اہمیت ہے کہ انہوں نے مثنوی کے اس حصے پر خاص توجہ دی جس کا تعلق احیائے دین اور علوم طبعیہ کے بعض انکشافات سے ہے۔ شبلی نے مثنوی کو ابن عربی کے اثرات سے نجات دلا کر غزالیؒ کی تحریکِ تجدید دین وتکمیلِ اخلاق سے منسلک کر دیا۔ انہوں نے مجرّد فکر اور فلسفہ اجتماع دونوں کے نقطہ نظر سے اس کا علمی تجزیہ کیا۔ مثنوی رومی اور علوم جدید میں مطابقت پیدا کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ جس نے آگے چل کر مثنوی کی علمی تشریح وتعبیر کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

جدید زمانے میں مطالعہ رومی کی تحریک کا نقطۂ عروج اقبال کا تجزیہ مثنوی ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے مطالعہ رومی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انہوں نے مثنوی کو محض مطالعہ کی کتاب سے اثباتی فکر وعمل کی کتاب میں بدل دیا۔ ان کے نزدیک مثنوی کی غایت تفریح یا (بلند تر سطح پر) جدل وجدال نہیں بلکہ عمل اور فکر کی وہ تعمیر ہے جس کے سہارے انسان عالم انفس وآفاق کی تسخیر کر سکتا ہے اور یاد رہے کہ اقبال کی تسخیر انفس وآفاق کا دائرہ اثر صرف ذات اور فرد کی اکائی تک محدود نہیں بلکہ اس کے قوسِ صعودی کی حدِ ملت اور اس سے بھی آگے نوع انسان کے نوعی اور اجتماعی ارتقاء کے بعید ترین گوشوں سے جا ملتی ہے۔

میں نے سطورِ بالا میں یہ عرض کیا ہے کہ اقبال نے مثنوی کو مطالعہ کی کتاب سے عمل کی کتاب بنا دیا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اقبال سے پہلے مثنوی ایک بے اثر کتاب رہی۔ مثنوی اس سے پہلے بھی یقیناً بڑی با اثر، مقبول اور مفید کتاب ثابت ہوتی رہی ہے۔ (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ثابت کیا گیا) مگر اس میں کچھ کلام نہیں کہ مثنوی کے فیوض کی جو حدیں اقبال نے دریافت کی ہیں وہ ان سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیں اور چند مستثنیات کے سوا عموماً یہ نظر آتا ہے کہ مثنوی دانوں اور مثنوی خوانوں نے مولانا روم کی اس نصیحت پر عمل نہیں کیا جو

انہوں نے (ایک روایت کے مطابق) مثنوی کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے لکھی تھی۔ ان کی نصیحت یا ہدایت یہ تھی۔

'مثنوی را جہتِ آں نگفتہ ام کہ حمائل کنند و تکرار کنند بلکہ زیر پا نہند و بالائے اسماں روند کہ مثنوی نردبانِ معراجِ حقائق است نہ آنکہ نردبان را بگردن گیری و شہر بہ شہر بگردی' ہرگز بر بامِ مقصود نردی و بمرادِ دل نرسی' اور حق تو یہ ہے کہ اقبال تک مطالعہ 'مثنوی کی عمومی حیثیت یہی رہی جو 'حمائل کنند و تکرار کنند' میں ہے۔ اقبال نے اس کمی کو محسوس کیا اور رومی کی ہم نوائی میں جاوید (یا نژادِ نو) کو یوں مخاطب کیا:۔

(۱) پیر رومی را رفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
(۲) شرح او کردند ادراکس ندید — معنیٔ او چوں غزال از مارمید
(۳) رقصِ تن از حرفِ اُو آموختند — چشم راز رقصِ جاں بر دوختند
(۴) رقصِ تن در گردش آرد خاک را — رقصِ جاں برہم زند افلاک را
(۵) علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست — ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
(۶) رقصِ جاں آموختن کارے بود — غیر حق را سوختن کارے بُود

ترجمہ:۔ (۱) پیر رومی کو اپنا رفیق راہ بنالے تا کہ خدا تجھ کو سوز و گداز عطا کرے۔
(۲) سب اس کی شرح کرتے ہیں اور اس کو کسی نے نہیں دیکھا اس کے معنی غزالوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔
(۳) اس سے لوگوں نے صرف رقصِ تن ہی سیکھا۔ اور رقصِ جان سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔
(۴) رقصِ تن خاک کو گردش میں لاتا ہے جب کہ رقصِ جاں افلاک کو برہم کر دیتا ہے
(۵) علم و حکمت رقصِ جان کا باعث بنتے ہیں اور زمین و آسمان کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔
(۶) اصل کام تو رقصِ جاں سیکھنا ہے اور غیر حق کو جلا کر خاک کر دینا اس کا کام ہے۔

مطالعہ 'مثنوی کے سلسلے میں اقبال کا نصب العین یہی رقصِ جاں ہے جس سے علم و حکمت تک رسائی ہوتی ہے۔ ایسے علم و حکمت تک جس سے زمین و آسمان کی تسخیر ممکن ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن کے بعد جو کتاب اس مقصدِ عظیم کو پورا کرسکتی ہے وہ مثنوی رومی ہے۔ اقبال کے مطالعہ مثنوی کا یہی پہلو نیا اور انوکھا ہے جس تک متقدمین و متاخرین میں سے کوئی نہ پہنچا۔

اقبال کے میلانات کا ایک عجیب انداز یہ ہے کہ وہ مثنوی رومی کے اثر کا تو اعتراف کرتے ہیں مگر حدیقۂ سنائی کا چنداں اعتراف نہیں کرتے اور عطار کی عظمت تو ان میں مشکوک سی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں بزرگ رومی کے مرشدانِ روحانی تھے۔

ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

(ہم سنائی اور عطار کے لئے آئے ہیں۔)

اس کا سبب یہ ہے کہ سنائی اور عطار کی کتابیں (اقبال کی نظر میں) اس رقصِ جاں یعنی اس ذوق وشوق اور علم وحکمت سے محروم ہیں جس سے رومی کی مثنوی از سرتا پا لبریز ہے۔ حدیقہ میں اخلاقیات کا پہلو غالب ہے اور عطار کی مثنویوں میں ظاہری دین داری پر زیادہ زور ہے۔ اقبال کی نظر میں یہ دونوں باتیں کافی نہیں۔ اقبال کو جس شئے کی طلب ہے وہ ہے زندگی کا سوز اور ایک مثبت فلسفۂ حیات۔ ان مسائل میں اقبال کو رومی سے بہتر کوئی رہنما میسر نہیں آیا۔

رومی آں عشق ومحبت را دلیل

تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل

ترجمہ:۔ رومی جو عشق ومحبت کی دلیل ہیں۔ ان کا کلام تشنہ کاموں کے لئے سلسبیل ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری سے بھی اپنی پیاس بجھائی ہے اور اپنے حکیمانہ خطبات سے بھی۔ مگر اقبال کا استفادہ صرف استفادہ ہی نہیں افادہ بھی ہے۔ انہوں نے رومی سے صرف لیا ہی نہیں ان کو کچھ دیا بھی ہے بہت کچھ! معتد بہ! اقبال کی پیشکش رومی کی بارگاہ میں وہ نئی تعبیر وتوجیہ مثنوی ہے۔ جس سے رومی کے خیالات میں نئی تابانی' نئی چمک پیدا ہوگئی ہے۔ رومی کی روح پہلی مرتبہ ان قیود سے آزاد ہوئی جن میں پرانے فرہنگ نویسوں اور شرح نگاروں نے اس کو قید کردیا تھا۔ اقبال نے رومی کو جدید حکمت میں متعارف کرایا ہے اور یہ ثابت کردیا ہے کہ رومی کے پاس عصرِ حاضر کے ان مسائل پیچیدہ کے کامیاب حل بھی موجود ہیں جن سے انسان حواس باختہ ہوکر اپنی روشن تقدیر سے مایوس ہوتا جارہا ہے۔ موجودہ دور میں دنیا کو ایک ایسے مذہب (یا مسلک فکر وعمل) کی تلاش ہے جس کے اساسی اصولوں سے سائنس بھی انکار نہ کرسکے۔ اور ایک ایسے سائنسی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے جس میں وجدانیات کے وجود کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہے زیرکی اور عشق کا یہ اجتماع انسان کے روشن مستقبل کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم انسانی کے لئے

آب وہوا کا وجود۔ اقبال نے ان میں سے اکثر مسائل کے حل رومی کے حوالے سے پیش کئے ہیں۔ اور یہ حکمتِ رومی کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

اقبال نے رومی سے استفادہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ ایک دبستانِ فکرِ رومی کی بنیاد رکھی ہے ان کے زیر اثر رومیؒ کے مطالعہ وتجزیہ کی تحریک کو بڑا فروغ ہوا ہے۔ چنانچہ اب اقبال کے خاص نقطۂ نظر سے رومی کے افکار کی چھان پھٹک کا کام بڑے زور سے ہو رہا ہے۔ [1] یہ صحیح ہے کہ محض رومانی ذوق وشوق کے خیال سے بھی رومی کی تلاوت کا عمل پہلے سے کم نہیں مگر اقبال کے زیر اثر ان کی حکمت کی تشریح کی طرف خاص توجہ کی جارہی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سب سے نمایاں کام ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ہے جن کی کتاب حکمتِ رومی' رومیاتی ادب کی ایک ممتاز تصنیف ہے۔ جس سے فکر رومی کے بہت سے عقدے حل ہوئے ہیں۔ ان سب پہلوؤں سے اگر دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مطالعہ اقبال کے سلسلے میں رومی کی مثنوی اور ان کے افکار ایک اہم بلکہ اہم ترین ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح مطالعۂ رومی کے سلسلے میں اقبال کی شرح وتعبیر یکتا اور منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

---

[1] نئے زمانے میں جن لوگوں نے مثنوی رومی کا خاص مطالعہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر نکلسن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے مثنوی کا ذوق عام کیا اور میر ولی اللہ' عبدالماجد دریابادی اور قاضی تلمذ حسین نے مثنوی سے استفادہ بھی کیا اور اس کی ترتیب وتدوین کی بھی کوشش کی۔ ڈاکٹر عشرت حسن بھی حکمت رومی کے بعض پہلوؤں کی اسرار کشائی میں مصروف ہیں۔ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی نے 'مولانائے روم تمثیلات کی روشنی میں' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔

ماخوذ :از مسائل اقبال۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ مئی ۱۹۷۴ء

○○○○

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

# رومی اور اقبال

چو رومی در حرم دادم اذاں من — از و آموختم اسرار جاں من
بہ دورِ فتنہ عصرِ کہن او — بہ دورِ فتنہ عصرِ رواں من

(مثل رومیؒ حرم میں میں نے اذان دی ہے۔ اسی سے اسرارِ جاں بھی میں نے سیکھے ہیں۔)

مثال رومؒ دیتا ہوں اذاں میں — اسی سے سیکھتا ہوں سرِّ جاں میں
بہ دورِ فتنہ عصرِ کہن وہ — بہ دورِ فتنہ عصرِ رواں میں

(ترجمہ: م۔م)

اقبال نے ان اشعار میں جو دعویٰ کیا ہے وہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ اقوام کو جس قسم کے فتنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں کوئی فتنہ سیاسی ہوتا ہے۔ کوئی علمی یا عقلی اور کوئی فتنہ اخلاقی اور روحانی۔ کسی ملت کی اساسی حیثیت کی استواری کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ کہاں تک ان مختلف اقسام کے زلزلوں سے متزلزل ہو کر پھر اپنا توازن قائم کر سکتی ہے۔

اسلام اپنی چودہ سو سال کی تاریخ میں ہر قسم کے فتنوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد ہی تمام عرب میں عدم ادائیگیٔ زکوٰۃ کا فتنہ بپا ہوا اور جھوٹی نبوت کے مدعی پھر بڑے بڑے قبائل کو ساتھ ملا کر الحاد پر تل گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے قوی ارادے والا عظیم الشان انسان بھی کچھ عرصہ کے لئے متذبذب اور متزلزل ہوا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی بصیرت نے جلد ان کی ہمت بندھا دی۔ اس کے بعد رنگا رنگ کے سیاسی اور عقائدی فتنے برپا ہوتے رہے لیکن اسلامی تہذیب وتمدن وسیاست دنیا پر چھاتی گئی اس کے بعد سب سے زیادہ ملت کو بیخ وبن سے اکھاڑ دینے والا فتنہ' فتنۂ تاتار تھا۔ جس کے متعلق اسلام کے ضامن خدا نے یہ معجزہ دکھایا کہ

بقول اقبال ۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اقبال نے ان اشعار میں ایک فتنہ عصر کہن کا ذکر کیا ہے جس کو فرو کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے رومی کو خدا نے ایک خاص وجدان اور ایک خاص اندازِ بصیرت بخشا تھا۔ رومی کے زمانہ میں شدید قسم کے سیاسی فتنے بھی موجود تھے۔ لیکن اقبال جس فتنے کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ عقلی، اخلاقی اور روحانی فتنہ ہے۔ رومی کے عہد میں ایک محدود قسم کی یونانی حکما سے اخذ کردہ عقلیت نے اسلامی عقائد کو منطق اور علم الکلام کی ایک چیستاں بنا دیا تھا اور سادہ روحانیت والے لوگ اس سے بیزار ہو کر پکار اٹھتے تھے:

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست  بر عاشقاں جز خدا ہیچ نیست

(عقل کے راستے میں پیچیدگیاں ہی پیچیدگیاں ہیں۔ عاشقوں کے پاس خدا کے سوا کچھ اور نہیں۔)

اسلام بھی انسان کو تدبر اور تفکر اور مظاہر ارض وسمٰوٰت کا گہرا مطالعہ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور عقل کو استعمال نہ کرنے والوں کو جانور بلکہ اس سے کمتر مخلوق گردانتا ہے۔ لیکن جس قسم کی عقل کو قرآن کریم استعمال کرنے کی تعلیم دیتا ہے وہ عقل ایسی ہونی چاہیے جو انفس وآفاق کے وسیع مطالعہ پر مبنی ہو اور غیر ملوث بصیرت سے اس سے صحیح نتائج اخذ ہو سکیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو عقل فقط ظنیات کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے۔ اور اس کھیل میں اس کو لذت ملنی شروع ہو جاتی ہے۔ مولانا روم کے زمانہ میں عقلیات کا ڈھانچہ کچھ اس انداز کا تھا جو نہ مشاہدۂ فطرت میں معاون ہوتا تھا اور نہ توسیع و تزکیہ نفس میں۔ اس قسم کی بحثیں کہ کلامِ الٰہی حادث ہے یا قدیم۔ ذات صفات سے الگ ہے یا اس سے غیر منفک طور پر وابستہ۔ تعددِ صفات سے توحید میں شرک پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ خدا ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے یا نہیں۔ اور توحید تمام علائق اور اضافات سے منزہ ہو کر خالص ہوتی ہے یا اضافات اس کا لازمی جزو ہیں۔ اس قسم کی منطقی بحثیں جزو دین بن گئی تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان بحثوں نے اصلی دین کو برطرف کر کے اس کی جگہ لے لی تھی۔ کچھ سیاسی دھڑے بندیوں نے اور کچھ اس قسم کے لاطائل مباحث مے فروعی اور غیر اصلی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں میں بے شمار فرقے پیدا کر دیئے تھے۔ معقولات والوں کا یہ حال تھا

کہ وہ یونانی حکما کے مرید ہو گئے تھے۔ اور ان کی ظنیات کو وحی الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم اہل عقل ہیں۔ لیکن تھے حقیقت میں وہ بھی اہل نقل۔ ان لوگوں نے ان ظنیات کو اسلام کے ساتھ ایسی آمیزش کی تھی کہ دودھ اور پانی کو الگ کرنا محال ہو گیا تھا۔ متکلمین مناظرہ پسند تھے۔ اور متقشفین ظاہر پرست۔ متکلمین کے ہاں بس قیل وقال تھی۔ اور راسخ العقیدہ کہلانے والے علما کے ہاں فقط ظاہر پرستی اور لفظ پرستی۔ دین کی روح نہ اس طبقہ میں تھی اور نہ اس طبقہ میں۔ روحانیت کے دعویدار رہبانیت اور ترکِ دنیا پر مائل تھے۔ یا کم از کم اس کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کے ہاں نہ آفاق کا مشاہدہ تھا نہ تسخیر فطرت اور تقویتِ ملت کی خواہش۔ تصوف ایک حیات گریز چیز بن گئی تھی۔ دنیا کا کوئی شعبہ قابل اعتنا نہ تھا۔ قرآن کی تعلیم یہ تھی کہ ظاہر بھی حق ہے اور باطن بھی حق۔ اول بھی حق ہے اور آخر بھی حق۔ خدا کی خلقت اور کائنات میں نہ بطلان ہے اور نہ فتور۔ لیکن دنیا کو ہیچ سمجھنے والوں نے اس کو دیوانے کا خواب بنا دیا تھا:

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

علم وحکمت کو قرآن کریم خیر کثیر کہتا ہے۔ لیکن صوفیوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ علم حجابِ اکبر ہے۔ خدا وجود کو حقیقی کہتا ہے۔ اور نعمت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لیکن صوفی کہتا تھا کہ تیرا وجود ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ صوفیائے کرام جو حقیقت آشنا تھے وہ بھی ان کلمات کو دہراتے تھے۔ لیکن ان کے ہاں ان کی لطیف تعبیریں تھیں۔ متصوفین کے ہاں ان تصورات نے فرار عن الحیات کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور غلط تصوف نے وجود کی بجائے عدم کی توصیف کو اپنا مسلک بنا لیا تھا:

صورتِ وہمی بہ ہستی متہم داریم ما　　چوں حباب آئینہ بر طاق عدم داریم ما

(ہستی پر ہم نے وہم کا اتہام لگا دیا　　طاق عدم پر حباب کا آئینہ لگا دیا)

تمام کائنات خدا کا خواب وخیال بن گئی تھی:

تا تو ہستی خدائے در خواب است　　تو نہ مانی چو او شود بیدار

(جب تک تو جاگتا ہے خدا سو رہا ہے جب وہ جاگ جائیگا تو باقی نہ رہے گا۔)

خدا جب تک خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ کیمیائی کائنات تب تک قائم معلوم ہوتی ہے۔ اگر کہیں وہ جاگ اٹھا تو بس:

عدمی عدم عدمی عدم زعدم چہ صرفہ بری عبث

(سب عدم ہی عدم ہے تو عدم سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔)

اسلام کا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں اس طرح رہا جائے کہ دنیا دین بن جائے لیکن ترکِ علائق کی تعلیم نے یہ زور پکڑا کہ:

ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولیٰ ترکِ ترک

غرض کہ رومی کے زمانہ میں ملا ظاہر پرست رہ گیا تھا اور فقیہ وفتر پرست۔ یہ گروہ دین کے مغز کو چھوڑ کر اس کی ہڈیاں چبا رہے تھے۔ بلکہ ان ہڈیوں پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اسی صورت حال کے متعلق مولانا روم کا یہ مشہور شعر ہے:

من زقراں مغزہا برداشم استخواں پیش سگاں اندا ختم

میں نے قرآن سے مغز اٹھالیا ہے اور ہڈیوں کو کتوں کے سامنے پھینک دیا ہے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ رومی اور اقبال کے زمانوں میں کس قسم کی مطابقت ہے اور ان دونوں نے اپنے اپنے زمانے کے احوال وافکار کی نسبت جو زاویہ نگاہ اختیار کیا اس میں کیا مماثلت ہے؟ رومی کے زمانہ میں ایک خاص قسم کے عقلی علوم کا چرچا تھا اور ایک خاص انداز کا فلسفہ جزو تعلیم بن گیا تھا۔

رومی کی مثنوی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام عقلی علوم سے کماحقہٗ واقف ہے اور ان سے واقف ہوتے ہوئے اور ان میں جس قدر حقیقت کا پہلو ہے اس کو اپناتے ہوئے بھی کسی محدود اور ظنی عقلیت کا شکار نہ تھا بلکہ ہر مسئلہ پر رومی غیر معمولی بصیرت اور غیر معمولی جرأت سے تنقید کرتا ہے۔ وہ عقل کو خدا کی ایک عظیم نعمت سمجھتا ہے اور حکمت کا دلدادہ ہے۔ لیکن اس کے ہاں عقل وحکمت کے دائرے بڑے وسیع ہیں۔ اس کی عقل صرف مادّیات اور حسیات تک محدود نہیں۔ وہ عقل کو صفات اللہ کا ایک عالمگیر مظہر تصور کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

آں چہ دریا ہا ست در پہنا ئے عقل

(عقل کی پہنائیوں (وسعتوں) میں کتنے ہی دریا موجود ہیں۔

اس کے نظریۂ حیات میں مادّے سے لے کر خدا تک زندگی ہی زندگی ہے۔ لیکن انتہائی پستی سے انتہائی بلندی تک اس کے بہت سے مدارج ہیں۔ ہر درجہ حیات زندگی ہی کا ایک درجہ

ہے۔اور جہاں زندگی ہے وہاں کسی نہ کسی درجے کی عقل بھی ہے۔ چنانچہ عارفِ رومی عقل جمادی' عقل نباتی' عقل انسانی اور عقلِ نبوی کے مدارج کا ذکر کرتا ہے۔ خدائے حکیم کی خلقت اور مظاہر میں سے کوئی مظہر حکمت سے خالی نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جس درجے کا مظہر ہے اسی درجے کی عقل ہے۔

اقبال اور رومی کے ہاں بہت سے نظریات مشترک ملتے ہیں۔ اقبال کا نظریہ خودی جو اقبال کے کمال کی وجہ سے اس کا اپنا بن گیا ہے۔ اس کے بنیادی تصورات بھی رومی کے ہاں ملتے ہیں۔ عام صوفیا نے فنا اور ترک پر زور دینا عین دین بنالیا تھا۔ رومی نے اس کو بقا کے نظریہ میں بدل دیا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ہر ترقی کے لئے پہلی حالت کو فنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مقصود بقا اور ارتقا ہے۔ رومی کے ہاں بھی خودی کا استحکام لازمی ہے۔ اور اس کا طریقہ قوتِ تسخیر میں اضافہ کرنا ہے۔ عجمی تصوف نے ترکِ حاجات کو خدا رسی کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ رومی کہتا ہے نہیں حاجت تو مصدرِ وجود اور منبعِ بہبود ہے۔ ہاں یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ حاجات کہیں پست اور حیات کش نہ ہوں۔ زندگی کے تقاضے بلند ہونے چاہئیں۔ رومی کی تلقین اس بارے میں یہ ہے کہ:

پس بیفزا حاجت اے محتاجِ زود

(اے جلد باز بلندتر حاجت پیدا کر)

مثنوی میں اس مصرع کی تشریح میں مولانا روم لکھتے ہیں کہ خدا نے زمین و آسمان بھی عبث نہیں پیدا کئے بلکہ کسی حاجت ہی سے پیدا کئے ہیں۔

اسی خیال کو اقبال طرح طرح سے اپنے فارسی اور اردو کلام میں ادا کرتا ہے۔

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را ورا از مدعاست

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست — فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

از تمنا رقص دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

(زندگی کی بقا حصولِ مدعا سے ہے۔ اس کے کارواں کو مدعا ہی بانگِ درا کا کام کرتی ہے۔ زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔ آرزو اس جہانِ رنگ و بو کی جان ہے۔ ہر شئے کی فطرت آرزو کی امین ہے۔ یہ آرزو / تمنا ہی ہے۔ جس کے سبب سینے میں

دل رقص کر رہا ہے۔ اور اسی آرزو کی تب و تاب سے سینے آئینے کی طرح چمک اٹھتے ہیں۔)

اس کے بعد عقل کی آفرینش کا نظریہ اقبال کے ہاں ملتا ہے کہ عقلِ ندرت کوش وگردوں تاز بھی آرزو ہی کا اعجاز ہے اور عقل آرزو ہی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔

اقبال اور رومی میں اور بھی کئی مشترکہ باتیں ہیں۔ دونوں بقا پرست ہیں اور دونوں ارتقا پسند۔ مولانا فرماتے ہیں کہ تمام زندگی خدا ہی کی ذات سے سرزد ہوتی ہے۔ اور تمام زندگی کا میلان خدا کی طرف رجعت ہے۔ کیونکہ وجود کا اصل اصول یہ ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف عود کرتی ہے۔ کل شیء یرجع الیٰ اصلہ

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

(ہر وہ شخص جو اپنی اصل سے دور جا پڑا پھر وہ اپنی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔)

اس رجعت الی اللہ میں ہر چیز اوپر کی طرف اٹھ رہی ہے۔ ہر وجود کے اندر صرف اپنے آپ کو قائم رکھنے ہی کا میلان نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مخفی ممکنات کو ظہور میں لانے کی مضطربانہ آرزو ہے۔ تمنائے رفتار سے پاؤں پیدا ہوتے ہیں اور تمنائے نوا سے منقار۔ چونکہ خدا کی ذات لامتناہی ہے اس لئے مرحلہ بھی کبھی طے نہیں ہوسکتا:

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

قرآن کریم کہتا ہے کہ آفاق آدم کے لئے مسخر ہو سکتے ہیں اور اقبال اور رومی دونوں فقط آفاق کی تسخیر پر قناعت نہیں کرتے۔ عارف رومی کہتا ہے:

بریز کنگرہ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

کبریا کے کنگرے کے نیچے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو فرشتے کو صید کرتے ہیں۔ پیمبر کا شکار کرتے ہیں۔ اور یزداں کو پکڑ لیتے ہیں۔

اور اقبال اس کا ہم نوا ہو کر پکارتا ہے:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

(میرے جنوں کے دشت میں جبریل ایک صید زبوں ہے۔ اے ہمت مردانہ! ضرورت اس بات کی ہے کہ یزداں کو بھی اپنی کمند میں لے آ!)

اقبال اور رومی کے ہاں عقل اور عشق کا مضمون بھی مشترک ہے۔ عقل اور عشق کے

مقامات بھی ان دونوں کے ہاں ایک ہی قسم کے ہیں۔ دونوں کے ہاں زندگی اور خودی کی اصل عشق ہے۔ عشق ہی بقا اور ارتقا کا ضامن ہے۔ عقل عشق کا اولیں مظہر سہی لیکن بہرحال مظہر ہے۔ عقل عشق کا آلۂ کار ہے۔ عقل عشق کی مقصد برآری کی معاون ہے۔ زندگی کا حضور عشق کو حاصل ہے۔ اگرچہ اس کے ظہور میں عقل کارفرما ہے:

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن　　یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

عقل سے اسرارِ آفاق فاش ہوتے ہیں۔ لیکن عشق سے اسرارِ ذات کا انکشاف ہوتا ہے:

مذہبِ عشق از ہمہ دیں ہا جداست　　عشق اصطرلاب اسرار خداست

(مذہب عشق تمام دینوں سے جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ عشق تو خدا کے اسرار کا اصطرلاب (Laboratory) (معمل) ہے۔)

دونوں کے ہاں عشق کا مفہوم عام مفہوم سے اس قدر الگ ہو گیا ہے کہ مولانا روم لوگوں کو خبردار کرتے ہیں کہ جس عشق کا میں ذکر کرتا ہوں اس کو کہیں اشیا اور اشخاص کی طلب کا جذبہ نہ سمجھ لینا:

ایں نہ عشق است ایں کہ در مردم بود　　ایں فساد از خوردنِ گندم بود

(یہ عشق نہیں ہے جو عام لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ فساد تو گیہوں کھانے سے پیدا ہوا ہے۔)

دونوں کا عشق خودی میں خدا کی صفات پیدا کرنے کی کوشش اور تخلقوا باخلاق اللہ کی تفسیر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است　　وز شرابِ جانفزایت ساقی است

(اس زندہ رہنے والے عشق کو تلاش کر جو باقی رہنے والا ہے جو اس شراب جاں فزا کا ساقی ہے۔)

اشیا اور اشخاص کا عشق ایک آنی جانی چیز ہے۔ محبوب کے بدل جانے سے عشق بھی بدل جاتا ہے اور محبوب کے فنا ہو جانے سے اس کا عشق بھی زود و دیر فنا ہو جاتا ہے۔ دونوں کا عشق انفس و آفاق کی تمام کیفیتوں کو اپنانا اور جزوِ حیات بنانا ہے۔ یہ عشق عالمِ رنگ و بو اور عالمِ آب و گل تک محدود نہیں رہ سکتا:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا　　ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

آخر میں ایک اور مسئلہ میں رومی اور اقبال کا اشتراک قابل بیان ہے۔صوفی ہو یا ملاّ، متکلم ہو یا حکیم۔سب نے جبر کا عقیدہ جزوِ دین اور جزوِ حکمت بنا رکھا تھا۔اور تقدیر کا ایک غلط مفہوم قائم کر رکھا تھا کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ازل سے متعین ہے۔زاہد کا زہد اور رند کی رندی، محتسب کا احتساب اور چور کی چوری، سب مرضیٔ الٰہی سے سرزد ہوتی ہیں۔جبر کا یہ عقیدہ مسلمانوں کے عقائد اور ان کے ادبیات میں ایسا عام ہو گیا کہ زندگی کی جدوجہد کی قوتیں اس سے بری طرح متاثر ہوئیں:

حافظ بخود نہ پوشید این خرقۂ مے آلود — اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا
در کوی نیک نامی مارا گذر نہ دادند — گر تو نمی پسندی، تغییر کن قضا را

(حافظ نے خود یہ خرقۂ مے نہیں پہنا ہے۔[یہ تو اسی (خدا) کا پہنایا ہوا ہے۔اے پاک دامن شیخ ہم کو اس میں معذور جان!]۔نیک نامی کے کوچے میں اگر ہمارا گزر نہیں (تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں)۔اگر تجھے یہ پسند نہیں تو جا اور ہماری تقدیر (قضا) کو بدل دے۔

یا میر تقی میر کہتے ہیں:

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی — جو چاہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

'قدجف القلم' کے یہ معنی لیے گئے ہیں کہ کاتبِ تقدیر کا قلم ابدالآباد تک سب کی تقدیر مفصل درج کرنے کے بعد سوکھ گیا۔اب اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔حکما و صوفیا میں مولانا روم واحد شخص ہیں جنہوں نے تقدیر کی اس تعبیر کے خلاف بڑا مدلل اجماع کیا اور فرمایا کہ تقدیر خدا کے معین کردہ آئین کا نام ہے۔تقدیر زاہد کو زہد پر یا چور کو چوری پر مجبور نہیں کرتی بلکہ یہ کہتی ہے کہ خدا کا یہ قانون اٹل ہے کہ تقوٰی سے ایک خاص قسم کے نتائج صادر ہوں گے۔اور عصیاں و طغیاں سے دوسری قسم کے۔اسی کا نام سنت اللہ ہے جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

اقبال بھی بڑی شدت سے انسان کی خودی میں اختیار کے قائل ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ کافر مجبور ہوتا ہے اور مومن مختار۔اور اپنی خودی کو بلند کر کے مومن ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی رضا خدا کی رضا سے ہم کنار ہو جاتی ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مولانا روم ایک لطیف استدلال کرتے ہیں کہ جبر و اختیار کا مسئلہ تو کتے کو بھی معلوم ہے۔ کتے کو جب کوئی پتھر مارتا ہے تو حالانکہ چوٹ پتھر سے لگتی ہے۔لیکن وہ کاٹنے نہیں دوڑتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پتھر تو مجبور ہے۔ مارنے والا مختار ہے۔ اس سے بدلہ لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ پتھر مارنے والے کو کاٹنے دوڑتا ہے۔

اقبال اور رومی دونوں کا خیال ہے کہ تقدیر کے غلط مفہوم نے انسان کو خودی اور اخلاقی زندگی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اسی لئے ان دونوں نے اس کی شدید مخالفت کی ہے۔ اور تقدیر کا ایسا مفہوم پیش کیا ہے جو انسانی خودی اور جدوجہد کی قوتوں کو ابھارے اور زندگی کو سنوارے۔

(ماہِ نو۔ اپریل ۱۹۵۲ء)

ماخوذ از مقالاتِ حکیم جلد دوم: اقبالیات ،مرتبہ: شاہد حسین رزّاقی مطبوعہ ۱۹۶۹ء

○○○○

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

# اقبال اور مولانا رومی

مولانا رومی کی 'مثنوی معنوی' نے ایران' وسطی ایشیا' ایشیائے کوچک' افغانستان اور برصغیر کے مسلم ذہن پر ایک عرصے تک حکومت کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ قرآن مجید کے بعد شاید ہی کوئی اور کتاب ہو جو ہمارے نظام اقدار' نظام حکمرانی اور قربت الی اللہ کے مقاصد اولیٰ کے لئے 'مثنوی معنوی' کی طرح منبع ہدایت ثابت ہوئی ہے۔

علامہ اقبال جن کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں کہا تھا کہ:

'خدا کی رحمت ہو اقبال پر تعلیم مولانا روم کا اتمام کر رہا ہے۔'

وہ شاید ٹھیک ہی کہا تھا۔ علامہ اقبال نے 'مثنوئ روم' کو اپنے روحانی اور جمالیاتی نظام کا کچھ اس طرح حصہ بنایا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر بھی مختلف مسائل پر 'مثنوئ روم' کے خیالات کو اپنے خیالات کے طور پر پیش کرتے رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبال کے استاد مولوی میر حسن اور والد شیخ نور محمد نے 'مثنوئ روم' کا درس اس خشوع وخضوع کے ساتھ دیا تھا کہ اقبال نے بی۔اے کے طالب علمی کے زمانے میں اپنے ساتھی سوامی رام تیرتھ کو 'مثنوی مولانا روم' کی باقاعدہ تعلیم دی تھی۔ یہ وہی سوامی رام تیرتھ ہیں جن کی وفات پر علامہ اقبال نے اپنی نظم 'سوامی رام تیرتھ' میں جو 'بانگِ درا' میں شامل ہے اس طرح اظہار افسوس کیا ہے۔

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے — تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے
توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق — ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیمِ عشق

علامہ اقبال کا پہلا شعری مجموعہ 'اسرار خودی' بھی ان کے والد کے بے حد اصرار پر تخلیق ہوا۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ اقبال بوعلی قلندر کی مثنوی کے نمونے پر ایک عاشقانہ مثنوی

لکھیں لیکن اقبال مولانا روم کی مثنوی کے لحن اور بحر (Metrical composition) سے اس درجہ متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی پہلی فارسی تصنیف میں مولانا روم کی پیروی کی۔ اقبال پر مولانا روم کے اثرات کا ایک اور مظہر یہ ہے کہ جب اقبال کیمبرج یونیورسٹی کیلئے اپنا تحقیقی مقالہ Development of Metaphysics in Persia لکھ رہے تھے تو اس وقت وہ مولانا روم کو وحدت الوجود یصوفی سمجھتے تھے اور ابن عربی سے بے حد متاثر تھے ۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی وہ مولانا روم کی متابعت کے اس مرحلے میں نہ تھے جو 'جاوید نامہ' میں نظر آتا ہے۔ (یہی مقالہ میونخ یونیورسٹی میں Ph.D کے لیے پیش کیا گیا۔ اور یہ اس زمانے کے قانون اور رواج کے مطابق کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سعید اختر درانی نے اقبال کی 'غلط بیانی' کی طرف جو اشارے کئے ہیں وہ سراسر غلط ہیں جیسا کہ میں اپنے ایریل (Ariel) کے کالم میں پوری صراحت کے ساتھ بیان کر چکا ہوں [1] اور ڈاکٹر سعید اختر درانی نے میرے مؤقف کو چیلنج بھی نہیں کیا ہے۔ )

حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ اقبال کا فلسفہ ٔخودی اور اسکے تمام مقامات مثنویٔ مولانا روم سے مستنبط ہیں۔ بجائے اس کے کہ میں سید وزیر الحسن عابدی کے تحقیقی مقالے 'اقبال کے شعری ماخذ ۔۔ مثنوی رومی میں' [2] میں مندرج مماثلتوں کا مولانا روم اور اقبال کے اشعار کی صورت میں ایک طویل گوشوارہ پیش کروں اور ایک طرح سے سید وزیر الحسن عابدی کے وقیع کام کا اعادہ کروں میں صرف ان مضامین کی فہرست پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا جن کے تحت علامہ اقبال اور مولانا روم کے اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ ان موضوعات کی تعداد ۹۸ ہے اور ان موضوعات کے تحت ذیلی مضامین کی تعداد ۱۱۲ ہے۔ یعنی مثنویٔ مولانا روم اور اقبال کے فارسی کلام میں ۲۱۰ مماثلتیں ہیں۔ بسا اوقات تو اس قدر معمولی فرق نظر آتا ہے کہ علامہ اقبال کے یہاں ایک یا دو الفاظ کی تبدیلی نظر آتی ہے یا پھر ایک ہی مفہوم کو قدرے نئی Vocabulary میں نظم کر دیا گیا ہے۔ اقبال کی یہ وہ خوبی ہے جس کے بارے میں خلیفہ عبدالحکیم یوں رقم طراز ہیں:

'شعر میں اقبال نے جو موتی پروئے ہیں ان کے متعلق محض یہ کہہ دینا ناانصافی ہوگی کہ وہ موتی اس نے دوسرے جوہریوں سے لیے ہیں۔ ہیرا جب تک تراشا نہ جائے اور موتی جب تک

مالا میں پرویا نہ جائے اور جواہرات جب تک زیور میں جڑے نہ جائیں' ان کا جمال معمولی سنگ ریزوں اور خزف پاروں سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اقبال نے شاعری پر جو احسان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور ماضی اور حال کے وہ جواہر پارے جو نفس انسانی کے تارے ہیں کمال شاعری سے اس طرح تراشے اور پروئے اور جڑے ہیں کہ نوع انسانی کے لیے ہمیشہ کے لیے بصیرت افروز ہو گئے ہیں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اقبال ان بعض متضاد چیزوں کو جوڑ نہیں سکا جس وقت جو جس سے چاہا لے لیا۔ یہی اعتراض افلاطون پر بھی کیا گیا ہے۔ جلال الدین رومی پر بھی اور نطشے پر بھی۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ متضاد رنگوں کے تار و پود کو وہ دل کش نقشوں میں بن لیتا ہے۔ منطقی حیثیت سے کسی کو تشفی ہو نہ ہو لیکن بیان کی ساحری ایسی ہے کہ اقبال کو پڑھتے ہوئے تضاد کا احساس نہیں ہوتا۔[۳]

اقبال نے نطشے سے قوموں کے زوال کے اسباب لئے' مولانا روم سے ارتقا اور خوب سے خوب تر کی جستجو کے ذریعے قوموں کی تعمیرِ نو کا عزم لیا اور عالم اسلام پر منڈلاتے ہوئے زوال کے خاتمے کے لئے یہ ضروری خیال کیا کہ مومن خدائی صفات سے متصف ہو جائے تو پھر وہ نہ صرف اپنے زوال کو روک سکتا ہے بلکہ تعمیر و ترقی کی جلد از جلد منازل طئے کر کے قابل رشک ترقی کی منزل میں داخل ہو سکتا ہے۔ یہاں اقبال نے لفظ 'خودی' کو بعض مغربی فلسفیوں کے یہاں استعمال ہونے والے لفظ ego کے معنی میں استعمال کیا۔ نطشے نے بھی یہی کہا تھا کہ جن اقوام کی ego مردہ ہو جاتی ہے وہ جہدِ للبقا کی جنگ ہار کے معدوم ہو جایا کرتی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اقبال کے یہاں خودی (ego) کا مفہوم سراسر مغربی حوالوں سے آیا ہے لیکن یہاں بھی وہ بنیادی طور پر مولانا روم ہی سے مستفید ہوئے ہیں اور مولانا روم اپنے مرشد کے حوالے سے سینٹ جون آف دی کراس (St.John of the cross) سے۔ ایک خودی ہی کیا عقل و عشق کے مابین آویزش ہو یا جبر و قدر کی بحث ہو یا پھر ابلیس کے بارے میں اقبال کا تصور ہو' یا ارادہ و عمل کی بات' پیکارِ خیر و شر ہو یا تسخیر زمان و مکان ہو یا حسی ادراک و وجدان کا معاملہ ہو عشق اور تسخیر ارض کی بات ہو یا خودی اور ممکناتِ خودی کی تحقیق کا معاملہ ہو' اقبال نے جو کچھ سوچا ہے اور لکھا ہے وہ بڑی حد تک مولانا روم ہی کی فکر سے مستنبط

ہے۔ اقبال اپنی شاعری میں مغرب کے لئے خیالات کی آمیزش اور پیوند کاری کے سبب مولانا روم سے قدرے مختلف ہو جاتے ہیں لیکن وہ مضامین کی حد تک مولانا روم ہی کے متبع رہتے ہیں۔

مثلاً آپ خودی کے بنیادی مسئلے ہی کو لیجئے مولانا روم نے روحِ انسانی کے مستقبل کے بارے میں کہا ہے:

گوہر جاں چوں ورائے فصل است　　خوی او ایں نیست ''خوئی کبریا'' ست

(گوہر جاں فصل سے پرے ہے یہ اس کی خو نہیں بلکہ خوئے کبریا ہے۔)

اقبال کہتے ہیں:

تعمیر خودی میں ہے خدائی

یا

برائے او نگہ دارم خودی را

(اس کے لئے میں اپنی خودی کی حفاظت کرتا ہوں۔)

یہ وہ مقام ہے جہاں مولانا روم کی 'خوئی' اقبال کی 'خودی' بن جاتی ہے۔

اگر گوئی کہ 'من' وہم وگماں است
نمودش چوں نمودِ ایں وآں است
بگو بامن کہ دارائے گماں کیست
یکے در خود نگر ' آں بے نشاں کیست؟

اگر تو کہتا ہے کہ 'میں' محض وہم وگمان ہے اس کی نمود ایں وآں (اس کی اور اسی کی) نمود کی طرح ہے۔ مجھ کو بتلا کہ وارائے گماں کیا ہے؟ کبھی اپنے آپ کو دیکھ وہ بے نشان کون ہے؟

مولانا روم اسی مفہوم کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

از انا چوں رست ' شُد اکنوں انا
آفریں بر آں ' انائے بے عنا

(جب 'انا' سے چھوٹا تو اب کی انا (یعنی لمحاتی انا) بنا۔ آفریں ہے اس بے عنا انا پر یعنی ذات واجب پر)

زاں انائے بی انا خوش گشت جاں
شد جہاں او از انائے بے جہاں

(وہ انائے بے انا جان بن گئی پھر وہ انائے بے جہاں سے نکل کر جہان بن گئی)

مولانا روم کے مندرجہ بالا اشعار سے مولانا روم کے یہاں اقبال کی 'خودی' کے لئے 'انا' کا لفظ بھی موجود ہے جو حیران کن حد تک جدید مفہوم میں ایغو (ego) کا نعم البدل ہے اور یوں لگتا ہے کہ نطشے بذات خود جس انا کی تعمیر اور اضمحلال کی بات کر رہا ہے وہ مولانا روم پر نطشے کے مفہوم میں مستحضر تھا۔

بنا بریں یہ خیال درست ہے کہ اقبال نے جہاں کہیں لفظ 'خودی' استعمال کیا ہے وہ ایک طرح سے فرسودہ فکر کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔ مغلوں نے عالم اسلام کو جس طرح تاراج کیا مولانا روم کی بلخ سے بہ سمتِ قونیہ ہجرت خود اسی فتنۂ مغل کے باعث ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمانوں میں من حیثیت گروہِ دینی' زندگی اور نمو کی خواہشوں نے دم توڑ دیا تھا۔ نطشے کے خیال میں مذہب کی دو اقسام ہیں۔ ایک قسم اثباتِ حیات کی موید اور وکیل ہے اور دوسری نفیٔ حیات کی۔ وہ عیسائیت اور بدھ مت کو (بلکہ ہندو مت کو بھی) نفیٔ حیات کے مذاہب قرار دیتا ہے۔ اُس کے یہاں صرف وہی مذہب زندہ رہ سکتا ہے جو پیکارِ حیات کا قائل ہے۔ ہمہ دم مائل بہ ارتقا اور یہ کہ وہ اپنے پیروؤں کو غلامانہ اخلاق کے بجائے آقائی اخلاق کی تعلیم دے۔ وہ سمجھتا تھا کہ عیسائیت میں غلامانہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ فکرِ افلاطون کا اسی لئے مخالف تھا کہ اُس نے بھی پیکارِ حیات سے گریز اور غلامانہ اخلاق کی تعلیم دی ہے۔ اقبال نے رہبانیت کی مخالفت اسی بنیاد پر کی کہ وہ پیکارِ حیات اور اولوالعزمی کی راہ سے ہٹا کر ترکِ دنیا کی تعلیم دیتی ہے۔

اقبال کا خیال صحیح تو ہے لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ فتنۂ مغل نے اسلامی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور مسلمانوں کے جسدِ سیاست میں فتنے سے مقابلے کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔ ایک ایسی صورت میں جب مکمل شکست کے بعد اولوالعزمی کے جملہ محرکات دور از کار ہو گئے ہوں پیکارِ حیات کا Ideal بھی دور ہو جاتا ہے۔ اور قوموں کو تعمیرِ نو کے اہم کام کے لئے دوبارہ تیار کرنے کے لئے خاصہ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ رہبانیت اور ترکِ دنیا کے خلاف علامہ اقبال کے

جذبات اپنی جگہ پر درست تھے اور ہیں۔لیکن فتنۂ مغل کے بعد ایران میں صفوی ' ہندوستان میں مغل اور ایشیائے کوچک میں عثمانی ترک یعنی مسلمانوں کی تین مضبوط حکومتیں قائم ہوئیں اور ان حکومتوں میں عثمانی سلاطین کی حکومت نے ماسکو اور ویانا تک یورش کی اور اپنا دبدبہ قائم کیا۔اگر عثمانی حکمراں یا مغل حکمران چاہتے تو پرنٹنگ پریس اور بعد میں اسٹیم انجن کے ذریعہ جہازرانی اور صنعت وحرفت کی ترقی میں دلچسپی لے لیتے اور اپنے زیر تسلط ممالک کی علمی نشاۃ الثانیہ اور صنعتی ترقی کے لئے بروقت اقدامات کے ذریعے مسلم ممالک کو نوآبادیاتی استیلا سے محفوظ کر سکتے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اسلامی دنیا اپنی کمزور معیشت اور سیاست کے باعث نوآبادیاتی نظام کے لئے لقمۂ تر بن گئی۔ایک طرف برصغیر کی مسلم حکومت ختم ہوئی۔دوسری طرف عثمانیہ حکومت انیسویں صدی کے آخر تک یورپ کا مردِ بیمار بن گئی اور ایران کی قاچار حکومت مغربی دائرۂ اثر میں اس قدر آ گئی کہ اسے بوشہر پر برطانوی بیڑے کی یلغار کے بعد ۱۸۵۲ء میں ہرات سے ہاتھ دھونا پڑا۔

مغربی غلبے کے خلاف اسلامی ممالک میں جتنی تحریکیں بھی چلیں وہ اُن ہی علما کی سرکردگی میں چلیں جو جدید علوم اور مغربی تہذیب کو کلیتاً مسترد کرنے کے بجائے ان سے اخذ واکتساب کے ذریعے سیاسی طور پر طاقتور ہونا چاہتے تھے۔اسلامی دنیا کی رجعت پسندانہ تحریکوں کی نوآبادیاتی طاقتوں کے سامنے کچھ نہ چلی۔علامہ اقبال کے خطبات میں بھی جس پہلو پر زور دیا گیا ہے وہ برطانوی حکومت سے مقابلے اور مخاصمت کے بجائے سیاسی مطالبوں کے لئے آئینی راہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔(اسی سبب سے علامہ اقبال کا خطبۂ الہ آباد جو اس کتاب کے حصہ ضمیمہ جات میں شامل ہے' شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبوں کے ایک ایسے وفاق پر زور دیتا ہے جسے ہندوستان ہی کا حصہ ہونا تھا۔یہ اور بات ہے کہ حالات اس حصے کو علحدہ ہونے پر مجبور کریں جیسا کہ بعد میں عملاً ہوا بھی)۔

علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی دراصل کمزوروں کے لئے دوبارہ طاقتور ہونے کا ویسا ہی فکری نسخہ ہے جیسا کہ یورپ کے بعض مورخین اور مفکرین نے اپنی قوموں کی سیاسی پسپائی اور شکستوں کے بعد تعمیرِ نو کے لئے بعض ایسے سیاسی نظریات پیش کئے جو تنگ نظر قوم پرستی پر منتج ہوئے۔علامہ اقبال' ظاہر ہے کہ ان یورپی مفکروں سے بالکل متفق نہیں تھے۔ان کے یہاں بسا اوقات جمہوریت

سے نفور کے رجحانات کی عمل داری نظر آتی ہے اور یہ برصغیر کے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لئے جمہوری منطق کے خلاف رویہ ہے۔ چونکہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسی اقلیت خیال کرتے تھے جو ہندوستان کے اکثریتی فرقے کے نظریۂ قومیت سے متفق نہ تھی اور مذہب کو اساس قومیت خیال کرتی تھی اور نہ صرف برصغیر کے تناظر میں بلکہ ملت مسلمہ کے رُکن کی حیثیت سے بھی۔

اقبال کے یہاں اجتماعیت کے جس تصور سے رغبت ملتی ہے وہ شرر سے ستارہ اور ستارے سے آفتاب بننا چاہتا ہے۔ یعنی وہ مائل بہ ارتقا ہے۔

دم بہ دم نوآفرینی کار حُر
نغمہ ٔ پیہم تازہ ریز زِ تارِ حُر
فطرتش زحمت کشِ تکرار نیست
جادۂ او حلقۂ پرکار نیست

(دم بہ دم نئی تخلیق آزاد مرد کا کام ہے۔ اس کے تار سے ہر لمحہ نیا نغمہ نکلتا ہے۔ اس کی فطرت تکرار کی زحمت نہیں اٹھاتی۔ اس کا راستہ حلقۂ پرکار کی طرح نہیں ہے۔)

رومی تقریباً اسی خیال کو ذرا مختلف انداز میں اس طرح کہتے ہیں:

خلق را چوں آب داں صاف وزلال
و اندر و تاباں صفاتِ ذوالجلال
ہر نفس نومی شدن اندر بقا
بے خبر از نوشدنِ اندر بقا
کارگاہ صبحِ حق درنیستی است
غرۂ ہستی چہ داند نیست چیست

(خلق کو صاف و پاک پانی کی طرح سمجھ جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات چمکتی ہیں ہر لمحہ بقا کی منزل میں نو بہ نو جلوے ہیں نیستی میں صبح حق کی کارگاہ ہے ہستی کا غرور کب یہ جان سکے گا کہ 'نیست' کیا ہے؟)

وہ اقبال جو کارگاہ صبح حق کو 'نیستی' کے بجائے 'ہستی' سمجھتا ہے وہ اجتماعیت کی طاقت میں اضافے کو انسانی تہذیب واقدار کی ترقی ہی سمجھ سکتا ہے۔ اہم یہ نہیں کہ اقبال رومی اور نطشے کے

بیک وقت عاشق کیوں ہیں۔ اہم یہ ہے کہ اقبال نے نطشے کی فکر کے کون سے موتی چنے ہیں اور کن موتیوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

حوالہ جات

1)Ariel,Daily Dawn (Karachi ,21 February2001).

سید وزیر الحسن عابدی' 'اقبال کے شعری مآخذ ۰۰۰ مثنوی روم میں' (لاہور مجلس ترقی ادب' ۱۹۷۷ء)

خلیفہ عبد الحکیم' 'رومی نطشے اور اقبال' 'مقالاتِ حکیم' جلد دوم (لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ' ۱۹۶۹ء) ص ۲۶۹۔۲۷۰

ماخوذ : تلاش اقبال ۔ مطبوعہ ۲۰۰۴ء

☆☆☆☆

گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

ڈاکٹر منظر اعجاز

# مولانا روم

اقبال کی فلسفیانہ، حکیمانہ اور شاعرانہ شخصیت کا اہم وصف یہ ہے کہ انہوں نے جس طرح اپنے اقوال و اشعار اور افکار سے اپنے ہمعصروں اور آئندہ نسلوں کو متاثر کیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے متقدمین اور معاصرین کے صالح اثرات قبول کئے۔ اسی کشادہ قلبی اور وسیع النظری کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں بین الاقوامی سطح پر مشہور و معروف اور مقبول خاص و عام ہوئے۔ اور نہ صرف یہ کہ عالمی سیاست و تدبر کے معاملے میں ان کے نام کا شہرہ سات سمندر پار تک ہوا بلکہ انہوں نے عالمی ادب میں بھی اپنا ایک خاص اور اہم مقام بنالیا۔ کہا تو جاتا ہے کہ اقبال جدید ذہن رکھتے تھے۔ اور جدید مغربی علوم و افکار سے متاثر تھے اور ان کا نظام فکر مغربی فکری دھاروں ہی سے سیراب ہوا تھا لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اقبال کی ذہنی تعمیر کو سمجھنے کے لئے تین باتوں کو سمجھنا چاہیے۔ اور وہ تین باتیں یہ ہیں۔

۱۔ آریائی نسلی لاشعوری میراث

۲۔ خاندانی اسلامی لاشعوری میراث (تصوف کے ساتھ)

۳۔ شعوری مشرقی مغربی اکتسابات۔

یہ تینوں دھارے ہم آہنگ ہوکر اقبال کی ذہنی تشکیل بن جاتے ہیں۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مغربی افکار و علوم سے تحریک حاصل کی تھی اور افکار و علوم کی جانچ پڑتال مشرقی علماء، حکماء اور صوفیہ اور فقراء کے افکار و تصورات کی بنیاد پر کی تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں نہ صرف قرآن کریم کی تعلیمات اور سرور کائنات رسول اکرم ﷺ کے ارشادات اور سیرت پاک سے خاص طور پر استفادہ کیا (جو ان کے خاندانی اسلامی لاشعور کی دین تھی) بلکہ آریائی نسلی لاشعوری میراث سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روم و تبریز کے رموز اخذ کئے اور مشرقی و مغربی فلسفوں کے غائر

مطالعے پر اپنے افکار کی بنیاد رکھی ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے کلام کو شاعری کا درجہ دیا جانے لگا اور انہیں شاعر کہا جانے لگا تو انہوں نے بہت سارے تردیدی اشعار کہے ۔ یہاں تک کہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں انہوں نے شکایت کی:

من اے میرِ اممؐ داد از تو خواھم      مرا یاراں غزلخوانے شمر دند

(میں اے میرِ امم ﷺ آپ سے داد کا خواست گار ہوں ۔ مجھے میرے یاروں نے محض غزل خواں سمجھا ہوا ہے ۔)

یا وہ قوم کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اُو حدیث دلبری خواھد زمن      رنگ و آبِ شاعری خواھد زمن

کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید      آشکارم دید و پنہانم نہ دید

(وہ مجھ سے حدیث دلبری اور رنگ و آبِ شاعری کے طلب گار ہیں ۔ انہوں نے میری جان کی بے تابی پر نظر نہ کی ۔ میرے آشکار ہی کو دیکھا ۔ میرا اندرون نہیں دیکھا ۔)

اور اس سلسلے میں اقبال نے اپنی صفائی اس طرح پیش کی:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است      ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

روز محشر خوار و رسوا کن مرا      بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

(اگر میرے دل کا آئینہ بے جوہر ہے اور اگر میری شاعری میں قرآن سے ہٹ کر کوئی بات ہے تو مجھے حشر کے روز خوار اور رسوا کر دیجئے بلکہ اپنے پانو کا بوسہ لینے سے بھی مجھے محروم کر دیجئے ۔)

محولۂ بالا اشعار سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ اقبال بنیادی طور پر خود کو شاعر نہیں مانتے ۔ اور شاعر کہے جانے پر ہتک محسوس کرتے ہیں ۔ اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کے اشعار و افکار کا ماخذ قرآن ہے جسے تمام تر فصاحت و بلاغت اور معنی آفرینی کے باوجود بھی کوئی شعری مجموعہ نہیں کہہ سکتا۔

اب جن لوگوں نے مولانا جلال الدین رومی کے احوال پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی ہوگی انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگ سکتی کہ اقبال مولانا روم سے کس حد تک متاثر تھے ۔ یہاں وضاحت کی گنجائش نہیں ۔ اگر قول واقعی سچ ہے کہ 'عقل مندوں کے لئے اشارہ کافی ہے ۔ تو دیکھئے کہ مولانا

روم کیا فرماتے ہیں:

از ہم آن کہ ملول نہ شوند۔ شعری گویم  واللہ کہ من از شعر بیزارم

(اس خطرے سے کہ تم لوگ ملول نہ ہو جاؤ نیں شعر کہہ رہا ہوں ورنہ قسم خدا کی میں شعر وشاعری سے بیزار ہوں۔)

مولانا نے بزبان شعر بھی اس مفہوم کو ادا کیا ہے اور اپنی شاعری کے بنیادی مقصد کو اس طرح بیان کیا ہے:

من ز قراں مغز برداشتم  استخواں پیش سگاں انداختم

(میں نے قرآن سے مغز اٹھالیا ہے اور ہڈیاں کتوں کے سامنے ڈال دی ہیں۔)

بقول مولانا اصلاح الدین احمد:

'مولانا جلال الدین رومی بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے۔ بلکہ ایک مرد مومن تھے۔ جنہیں علم وفکر، ذوق وشوق، سوز وخلوص اور کلام وبیان کے خزائن عامرہ میں سے ایک بہرۂ عظیم عطا کیا گیا تھا ہی۔ خود اپنی زندگی کو ان مقاصد عالیہ اور ان اقدارِ جلیلہ سے ہم آہنگ کرنے کی توفیق بھی ارزانی ہوئی تھی جن کا فروغ ان کا منتہائے نظر تھا۔ (تصورات اقبال صفحہ ۲۳۷)

اور ولیم سی شٹک (WILLIAM C.CHITTIC) کے مطابق:

"Jalal al-Din one of the greatest spiritual masters of Islam, is well known in the west and next to al-Ghazzali perhaps the Sufi most studied by western orientalists"

(The Sufi Doctrine of Rumi- An Introduction. P.7)

'رومی اسلام کے وحید العصر روحانی پیشوا مغرب میں الغزالی کے بعد اہم ترین مفکر مانے جاتے ہیں اور ان کا گہرا مطالعہ مستشرقین کا خصوصی موضوع ہے۔'

آر۔ کے۔ نکلسن (R.K.NICHOLSON) کے مطابق:

"To those interested in the history of religion, morals, and culture, in fables and folklore in divinity, philosophy, medicine, astrology and the other branches of mediaeval

learning, in eastern poetry and life and manners and human nature, the Mathnawi should not be a sealed book even if it cannot always be an open one."

(The Mathnaawi of Jalaluddin Rumi. Translation P.17 Gibb Memorial series, New series IV, 1960. London)

('وہ لوگ جو مذہبی تاریخ' اخلاقی اقدار' تہذیب' حکایات پارینہ اور معاشرتی نغمات' روحانیت' فلسفہ' طب' علم ہیئت اور عہد وسطیٰ کے دیگر علوم کے علاوہ مشرقی شاعری' معاشرتی معاملات اور فطرتِ انسانی کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ان کے لئے مثنوی کو بند کتاب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اکثر و بیشتر ان پر منکشف نہ ہو۔')

مولانا صلاح الدین' رومی کے تصور عشق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'مولانا روم کی نگاہ میں عاشق صادق وہ ہے جس کا دل گرم' نگاہ پاک اور روح عمل خیر کے لئے سراپا اضطراب ہو۔ وہ نہ صرف اللہ پر بلکہ خود اپنے آپ پر ایمان رکھے کہ وہی اس جہانِ گذراں میں اس کا نائب اور اس کی مشیتوں کا نگراں ہے۔ تسلیم و رضا اس کا شیوہ' جانبازی و سرفروشی اس کا شعار اور خدمت خلق اس کی عبادت ہو۔' (تصورات اقبال صفحہ ۳۳۰)

بقول اقبال:

چہ باید مرد را طبع بلندے' مشرب نابے  دل گرمے' نگاہِ پاک بینے' جان بیتابے

(مردِ حق کو کیا چاہیے۔ طبع بلند اور مشرب ناب (خالص مشرب) دل گرم' نگاہ پاک بین او رجان بے تاب۔)

مولانا روم کے اثرات علامہ اقبال پر نوعمری کے زمانے سے ہی مرتب ہونے لگے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اور وہ صوفی گھرانہ بھی نومسلم تھا۔ جس میں مذہبی شدت پسندی کے عناصر شامل تھے۔ اقبال کے والد محترم شیخ نور محمد صوفی منش اور فقیر مشرب بزرگ تھے۔ اقبال کے بعض محققین اور خود اقبال نے بھی بعض کرامات ان کی ذاتِ بابرکات سے منسوب کی ہیں۔ اور بقول اقبال بنام جاوید (جاوید اقبال):

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ !

اقبال کے سوانح نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بچپن سے ہی ہر روز صبح میں تلاوتِ قرآن اقبال کے معمول میں تھی۔ ایک روز جب اقبال قدرے ہوش گوش والے ہو چکے تو والد نے کہا کہ قرآن پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کہ تم ہی پر نازل ہو رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے۔ اقبال ان ہی دنوں اپنے فاضل وقت میں والد کی سلائی کی دوکان میں بیٹھتے اور وہاں مثنوی مولانائے روم کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ اپنے والد کی ان ہی خصوصیات کی بنا پر انہوں نے کہا:

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضہ تحقیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں بات میں سادہ وآزادہ معانی میں دقیق
اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا اس کے احوال سے واقف نہیں پیران طریق

چنانچہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان ہی دنوں اقبال نے قرآن اور مثنوی مولانا روم کا تقابلی مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا جواز پہلے سے موجود تھا یعنی:

مثنویٔ مولویٔ معنوی ہست قرآں درزبان پہلوی

کیونکہ مولانا نے قرآن کے معانی ومفاہیم مثنوی میں سمیٹ لئے تھے۔ اس طرح انہوں نے قرآن کی جدید تفسیر منظوم صورت میں پیش کی اور زمانہ اسی کا متقاضی بھی تھا۔ علماء اور فقہا کی حالت بقول روم کتوں جیسی تھی۔ ایسی صورت میں عوام وخواص نے مثنویٔ معنوی کو الہامی صحیفے کا درجہ دیا۔ یہاں تک کہ مثنوی نے عالم اسلام کی سرحدوں سے آگے نکل کر غیر اسلامی دنیا میں بھی اپنے اثرات مرتب کئے۔ یہ دور خصوصاً عالم اسلام کے لئے ایسا دور تھا جس میں ملت اسلامیہ عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں اور چنگیزی قیامت کا شکار ہو کر اپنے اوپر نشۂ بیخودی طاری کر رہی تھی۔ یہ حالات کی نامساعدت کے مقابلے میں نفیٔ حیات کا اظہار تھا۔ روحانی، الہیاتی، تفکر کی فکری مایہ داری کو پھر ایک نئے چنگیزی چیلنج کا سامنا تھا۔ جبکہ کچھ ہی زمانہ قبل یونانی مفکر عالم اسلام کے لئے چیلنج بنا ہوا تھا۔ تو امام غزالی نے یونانی تفکر کی بنیاد پر یونانی فکری حملے کا مقابلہ کیا تھا

جس کی مثال ان کی گراں مایہ تصنیفات 'احیاء العلوم' اور 'المنقذ من الضلال' ہیں۔ جنکی ادبی گرفت ذہنوں پر شعری پیرائے کی گرفت کے مقابلے میں بہر حال کم ہے اور ایسا ہونا فطری بھی ہے۔ ملت اسلامیہ کی ذہنی حالت ساڑھے چھ سو سال پہلے مولانا روم کے زمانے میں ایسی ہی تھی اور پھر مولانا روم کے ساڑھے چھ سو سال بعد اقبال کے عہد کا حال بھی ویسا ہی تھا۔ اقبال نے 'مثنوی گلشنِ رازِ جدید' کی تمہید میں یہ بات واضح کردی ہے کہ مولانا روم کو چنگیزی قیامت سے واسطہ پڑا تھا اور میری نگاہ نے دوسرا انقلاب دیکھا ہے:

نگاہم انقلابے دیگرے دید　　طلوعِ آفتابے دیگرے دید

(میری نگاہ نے دوسرا انقلاب دیکھا　　ایک اور ہی طلوع آفتاب دیکھا)

ان کے عہد کی کشمکش کا تناظر رومی اور بوعلی سینا کے اس موازنے سے واضح ہوتا ہے:

بو علی اندر غبار ناقہ گم　　دست رومی پردہ محمل گرفت

(بوعلی غبارِ ناقہ میں گم ہوگئے　　اور رومی نے پردۂ محمل تھام لیا)

یہی وجہ تھی کہ اقبال نے مولانا روم کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرلیا۔ مولانا روم زاویۂ وجدان کے رہبر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اور اقبال بھی چونکہ وجدانی اہمیت کے قائل ہیں اس لئے مولانا روم کو وہ وجدانی تصور کے تحت اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ غزالی اور مولانا روم کے عہد کے جس تناؤ نے المنقذ اور مثنوی کی تحریک کی تھی اقبال کا عہد بھی اسی تناؤ سے دوچار تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مولانا روم حلقہ تصوف میں وحدت الوجود کے قائل ہیں اور حافظ بھی۔ لیکن اقبال کا خیال جداگانہ تھا۔

'جبکہ مولانا روم کو اپنا پیر طریقت تسلیم کرتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ حافظ کی حال مستی عمل میں مانع ہوتی ہے اور مولانا روم کی جستجو محرکِ عمل بن جاتی ہے۔ مولانا کا عشق عمل کا محرک جذبہ ہے۔ بقول مولانا اصلاح الدین احمد:

''مولانا کی اپنی زندگی اسی عشق صادق کی تفسیر تھی۔ رحم وکرم' جود وسخا اور مہر ومحبت ان کی شخصیت کے عناصر تھے۔ اور اس کے ساتھ انہیں حق پرستی اور راست بازی کی نعمتِ عظمیٰ اس کثرت سے عطا ہوئی تھی کہ حق کی پاسداری میں دنیا کے بڑے بڑے خطرے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ طبیعت کے انتہائی گداز ہونے کے باوجود شجاعت اور اعتمادِ محبت کا یہ عالم تھا کہ جب

ہلاکو خاں کے سپاہ سالار بیجو خاں نے قونیہ پر حملہ کیا تو اسے محصور کرلیا ۔محاصرے سے تنگ آ کر اہل شہر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔آپ نے ایک بلند ٹیلے پر جو بیجو خاں کے خیمے کے عین سامنے تھا جا کر مصلّے بچھا دیا اور نماز پڑھنی شروع کر دی ۔اہل فوج نے معاتیروں کی بارش کی لیکن مولانا استقلال اور دلجمعی کے ساتھ مصروف عبادت رہے ۔بیجو خاں نے خیمے سے کئی تیر چلائے لیکن اسے ایمان کا اعجاز کہئے یا عشق کی کرامت کہ مولانا کو کوئی گزند نہیں پہنچا اور وہ پورے خشوع وخضوع کے ساتھ برابر نماز پڑھتے رہے ۔بیجو خاں کے دل پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ محاصرہ اٹھا کر چلا گیا ۔(تصوراتِ اقبال صفحہ ۳۳۵)

اقبال مولانا کے تصور عشق اور ان کی عملی شخصیت سے بہت ہی متاثر تھے کیونکہ مولانا کے عشق میں بے عملی کی بجائے عمل کی حرکت وحرارت ہے ۔اقبال نے مولانا کے عشق کو اپنا مطمحِ نظر بنالیا کیونکہ وہ ایسے عشق کو کرامت تصور کرتے ہیں ۔وہ کہتے ہیں:

عشق کی مستی سے ہے پیکر گُل تابناک　　عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

حالات کی نامساعدات میں مولانا روم نے حیات کے جس ردعمل کا مظاہرہ کیا اس کی مثال عجم کے روایتی صوفیہ میں ملنی مشکل ہے ۔اس طرح صوفیانہ میلان کو دو ذہنی رویوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ان ہی دو ذہنی حالتوں کا بیان ہم اقبال کی فارسی نظم 'اگر خواہی حیات اندر خطر زی' میں پاتے ہیں ۔یہ ایک علامتی تمثیلی نظم ہے ۔جو عالم اسلام کے ذہنی فکری ماحول کی عکاسی کرتی ہے ۔یہ بظاہر صحرا میں دو غزالوں کے درمیان کا مکالمہ ہے ۔

غزالی　　باغزالی　　دردِ　　دل　　گفت

(ایک غزال نے دوسرے غزال سے اپنا دردِ دل بیان کیا ۔)

لیکن حقیقت میں یہ دو ذہنی صورتِ حال کا بیان ہے ۔الٰہیاتی تفکرات وتصورات کا جو حال انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہو گیا تھا وہ ایسا ہی تھا جس میں الٰہیاتی تصورات کی بقا کا امکان مفقود ہوتا جارہا تھا اور مادی ومثالی فلسفیانہ نظریات روحانی اور الٰہیاتی تفکر کی فکری مایہ داری کو چیلنج کررہے تھے ۔روایات اور فقہ کے بندھے ٹکے اصولوں میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ موجودہ علوم کا مقابلہ اپنی بنیادوں پر کرسکیں ۔یہ صورتِ حال ویسی ہی تھی جس میں غزالی نے یونانی تفکر کا مقابلہ یونانی فکری بنیاد پر کر کے 'احیاء العلوم' مرتب کی تھی ۔اقبال

نے بھی ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کیا اور انہوں نے غزالی کے ہی اصول کو اپنایا۔ ان کے خیال کے مطابق نامساعد حالات سے بھاگ جانا نفیٔ حیات ہے۔ کیونکہ حالات کی نامساعدت ردعمل کی قوت کو بڑھا دیتی ہے۔ اس تناظر میں نظم کا آغاز ہمارے ذہن کو فوراً 'احیاء العلوم' اور 'تشکیل جدید' کے دو غزالوں سے ملا دیتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات توجہ طلب ہے اور قبل عرض کی جا چکی ہے کہ امام غزالی کی احیاء العلوم میں فلسفیانہ اور منطقی خشکی ہے چنانچہ اس کے اثرات دیرپا ثابت نہ ہو سکے۔ امام غزالی نے اس کی خشکی کو اپنی دوسری تصنیف 'المنقذ' سے دور کرنے کی کوشش کی تو یہ عہد خود ان کی گوشہ گیری کا تھا۔ چنانچہ اس میں عجمی تصوف کا وہی منفی میلان ہے جس کی مخالفت اپنے عہد میں مولانا روم نے فکری اور عملی دونوں سطح پر کی۔ پھر جب اقبال نے اپنے عہد کا جائزہ لیا اور مولانا روم ہی کی طرح اس میلان کی مخالفت کی۔ اس ذہنی اور فکری ماحول کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

غزالی با غزالی دردِ دل گفت ازیں پس در حرم گیرم کنامی
بصحرا صید بنداں درکمیں اند بکامِ آہواں صبحی نہ شامی
اماں از فتنہ صیاد خواہم
دلم اندیشہ ہا آزاد خواہم

(ایک ہرن نے دوسرے ہرن سے کہا بس اب حرم میں گوشہ گیر ہو جائیں کیونکہ صحرا میں شکاری دام الجھائے بیٹھے ہیں اور ہرنوں کے لئے اب نہ صبح ہے نہ شام ہے۔ فتنۂ صیاد سے امان ہم ڈھونڈتے ہیں اور دل کو تمام اندیشوں سے آزاد رکھنا چاہیئے۔)

اس بند میں تصوف کا وہی منفی میلان ہے جس سے اقبال نے اختلاف کیا ہے۔ اقبال کا مشورہ ملاحظہ فرمائیں:

رفیقش گفت اے یار خردمند اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن رابر فساں زن زتیغِ پاک گوہر تیز تر زی
خطر تاب وتواں را امتحان است
عیار جسم وجاں را امتحان است

(اس کے ساتھی نے کہا کہ اے عقل مند اگر تو جینا ہی چاہتا ہے تو خطرات میں بھی ہر لمحہ خود کو کسوٹی پر رکھتا چلا جا اور تیغ پاک گوہر سے بڑھ کر جی۔ خطرہ طاقت کے لئے امتحان ہے۔)

اقبال جس خطر پسندی کی تلقین کرتے ہیں عملی طور پر یہ خطر پسندی غزالی یا دوسرے صوفیا میں نہ تھی جبکہ مولانا روم نے تیروں کی باڑھ پر اپنی زندگی کے عیار کو تول کر بتا دیا تھا۔ حیات کی تکمیل عشق کے بغیر نہیں ہو سکتی اور عشق جذبہ ایثار و قربانی کے بغیر اپنی تکمیل نہیں کر سکتا۔ ارادے کی پختگی، عمل کی شدت اور مقصد کی پاکیزگی وطہارت اس میں شامل ہے اور ان ہی مجموعی کیفیات کے اظہار کے لئے اقبال نے علامت کے طور پر لفظ خودی استعمال کیا ہے۔ آدم کی تخلیقی سرشت میں یہ عناصر موجود ہیں چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد　　حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور　　خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

(عشق نے نعرہ لگایا کہ خونیں جگر پیدا ہوا حسن لرز اٹھا کہ صاحب نظر پیدا ہوا۔ فطرت پریشان ہوگئی کہ جہاں مجبور کی خاک سے ایک خود گر، خود شکن اور خود نگر پیدا ہو گیا۔)

مولانا روم شمس تبریز کے رمز آشنا تھے چنانچہ بقول صلاح الدین احمد:

''مولانا کا کلام اسی گرمیٔ دل، اسی حرارتِ عشق، اسی اعتمادِ ذات اور اسی جذبہ رضا کا آئینہ دار ہے۔ وہ اس حیات مستعار کو اپنے طلب کی وسعتوں میں سمیٹ لیتے ہیں اور اس طرح سے بسر کرتے ہیں اور بسر کرنا سکھاتے ہیں کہ خود زندگی زندہ رہنے والے کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم زندگی سے کیا کیا لیں بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہم زندگی کو کیا کچھ دیں'':

(تصوراتِ اقبال صفحہ ۳۳۱)

مولانا روم انسانیت کے جملہ امراض کا علاج واحد عشق کو سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
(خوش ہو اے عشق خوش سودا مرے　　اے مری تمام بیماریوں کے طبیب)
جسم خاک از عشق بر افلاک شد　　کوہ در رقص آمد و چالاک

(خاکی جسم عشق کے فیض سے افلاک پر پہونچ گیا۔ پہاڑ رقص کرتا ہوا چست و چالاک ہو گیا)

عشق جانِ طور آمد عاشقا　　طور مست و خر موسیٰ صاعقا

(عشق جانِ طور بن گیا اے عاشق! طور مست ہو گیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے)

بالبِ دم سازِ خود گر جفتمی　　ہمچو نے من گفتنیہا گفتمی

(اگر لب دم ساز کو میں بانسری سے ملاؤں تو تمام گفتنی باتیں کہہ ڈالوں۔)

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　وز جدائی ہا شکایت می کند

(سنو تو بانسری کیا حکایت سنا رہی ہے۔ وہ تو جدائی کی شکایت کر رہی ہے۔)

سینہ خواہم شرح شرح از فراق　　تا بگویم شرح درد اشتیاق

(میرا سینہ فراق میں چھلنی چھلنی ہو گیا ہے تا کہ اپنا دردِ اشتیاق بیان کر سکوں۔)

یہ مولانا روم کے اشعار ہیں جن سے ان کے تصورِ عشق پر روشنی پڑتی ہے۔ روایتی صوفیا عشق میں وصال کے قائل ہیں لیکن مولانا روم فراق پر زور دیتے ہیں کیونکہ حالات کی نامساعدت میں عالمِ فراق بھی غنیمت ہے۔ مولانا روم کے اس وجدانی تصور کو مرتب کرنے میں شمس تبریز کی صحبتوں کا اہم رول تھا۔ اقبال اپنے آپ کو شمس تبریز اور مولانا روم دونوں کا رمز آشنا بتاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی　　برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(مجھے دیکھ کہ ہندوستان میں مجھ جیسا کوئی اور برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز نہیں ملے گا۔)

اس لئے اقبال بھی مولانا روم کی طرح عشق کی کیفیت میں فراق ہی کو ترجیح دیتے ہیں:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب
عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب
گرمیٔ آرزو فراق شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

پہلا تاثر، آخری تاثر والی بات اقبال پر بھی صادق آتی ہے۔ کم عمری کے زمانے سے ہی مولانا روم، اقبال کے دل و دماغ پر چھانے لگے تھے۔ چنانچہ 'بانگ درا' اور 'پیام مشرق' میں بھی مولانا موجود ہیں اور 'زبور عجم' میں پوری قوت و توانائی کے ساتھ ان کا ظہور ہوتا ہے:

راز معنی مرشد رومی کشود
فکر من بر آستانش در سجود

(معنی کا راز مرشدِ رومی نے مجھ پر کھولا۔ میری فکر ان کے آستاں پر سر بہ سجود ہے۔)

اقبال میں شخصیت کے تحفظ اور ارتقاء کی امنگ جگانے والے رومی ہی تھے۔ دوسری گول میز کانفرنس (لندن) سے جب اقبال بد دل ہوئے تو اس وقت بھی مولانا روم کے کلام نے انہیں سنبھالا اور مولانا روم کی عظمت کا سکہ ان کے دل پر بٹھا دیا:

ہم خو گرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحر پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی

اقبال کا عصر جن انقلابات کے اثرات کا آئنہ دار تھا ان میں ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ برطانوی نو آبادیاتی نظام میں خلل آ رہا تھا۔ شخصی حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ صنعتی، سیاسی اور مذہبی انقلابات رونما ہونے لگے تھے اور مختلف حالات میں کامیابیاں حاصل کر رہے تھے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان کی کشاکش ایک نئے مخلوط معاشی نظام کے تصور کو جنم دے رہی تھی اور صورت حال بقول اقبال یہ تھی:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
دلِ طور سینا و فاراں دونیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

یہ صورتِ حال ایسی تھی جو اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ انسانیت پھر ایک بار اتھاہ سناٹے سے دوچار ہونے والی ہے جہاں آگے کی راہ کا کوئی تعین ممکن نہ ہوگا اور پھر وجدان، روحانی اور اخلاقی اقدار ہی انسانیت کے ارتقائی سفر کو آگے بڑھانے کا کارنامہ انجام دیں گے۔ انہوں نے اس ماحول کو دیکھتے ہوئے کہا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہوگا

اقبال صرف اتنا ہی کہہ کر رک نہیں گئے تھے۔ انہوں نے اس دیرینہ بیماری اور اس دل کی نامحکمی کا علاج بھی اسی آبِ نشاط انگیز کو بتایا جس سے شمس تبریز اور مولانا جلال الدین رومی سرشار تھے:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

جدید سائنسی طلسم اور اس کے اثرات ونتائج پر جن لوگوں کی نگاہ ہے وہ اس غزل کو عصر حاضر کی روشنی میں محسوس کر سکتے ہیں:

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی
متاعِ دین ودانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی
وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی
حرم کے دل میں سوز آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری ابتک حجاب آمیز ہے ساقی
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب وگلِ ایراں' وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اقبال نے جس قدر مولانا روم کا اثر قبول کیا اس قدر مشرق ومغرب کے کسی بھی مفکر یا شاعر کا اثر قبول نہیں کیا اور مولانا روم کی یہ اثر پذیری اقبال کے نزدیک صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ ایک عظیم مفکر یا شاعر ہیں۔ بلکہ مولانا روم کے یہاں فکر وعمل میں کلی ربط ہے۔ وہ اپنے افکار کی تشریح

وتفسیر اپنے اعمال سے کرتے ہیں۔ اور اقبال کو مولانا کا یہی پہلو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے اور وہ مولانا روم کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کر لیتے ہیں۔ انہیں مولانا سے غیر معمولی عقیدت اور داخلی ربط ہے۔ اقبال نے نہ صرف یہ کہ بال جبریل کی نظم مریدِ ہندی اور مرشد رومی میں خود کو مرید اور مولانا کو مرشد قرار دیا ہے۔ بلکہ مولانا کی مثنوی کی تقلید اس طرح کی ہے کہ اسی زمین اور اسی بحر میں 'اسرار ورموز' اور 'جاوید نامہ' کی تخلیق کی۔ اسرار خودی کے آغاز میں انتساب کے طور پر مولانا کی ایک غزل کے تین اشعار شامل کئے اور اپنے اشعار واقوال کے ذریعہ بہت سارے مواقع ومراحل پر اس امر کا کھلے دل سے اعتراف واظہار کیا کہ رومؔی ان کے مرشدِ معنوی ہیں اور بصارت وبصیرت کی ساری منزلیں انہوں نے مولانا روم کی ہی روحانی رہنمائی میں طے کی ہیں۔

ماخوذ از:۔ اقبال۔عصری تناظر۔مئی ۱۹۹۶ء

○○○○

نذیر مومن

# اقبال اور رومی

اقبال کے کلام کی ہمہ گیری اور جامعیت میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ افکار کے تنوع اور تصورات کی ثروت میں شاید ہی کوئی اور شاعر اقبال کا مقابلہ کرسکتا ہو۔ جدید وقدیم فلسفہ استدلال۔ اسلامی وغیر اسلامی تصوف کے تمام پہلو۔ دنیا کی مختلف تہذیبوں کے نظام حیات۔ اخلاق کے اصول' تمدن کے قواعد وضوابط' انفرادی واجتماعی سلوک کے طور طریقے۔ اخلاقی اور سیاسی رجحانات۔ ان سب خیالات کو اقبال نے شعر کا جامہ پہنا کر پیش کیا لیکن ہم اقبال کی فکری ساخت کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کے کلام میں بھی دوسرے بڑے بڑے مفکروں کی طرح چند بنیادی تصورات پر زور دیا گیا ہے چنانچہ اقبال کی سمعی' بصری اور فوادی معلومات میں ایک داخلی توافق پایا جاتا ہے۔ یہ توافق اگر چہ ان کی شاعری کو چند بنیادی تصورات پر ختم کردیتا ہے۔ لیکن ان کی شاعرانہ پرواز خیال پر پابندیاں عاید نہیں کرسکتا۔ ان کا مرغ تخیل اپنے پر پرواز آزمانے کے لئے مختلف قسم کی فضاؤں میں پرواز کرجاتا ہے۔ اکثر اس جہان چار سو ورنگ وبو کی وسعتوں سے آگے بھی نکل جاتا ہے لیکن اس پرواز میں اس کی نگاہیں بدستور شاخ نشیمن پر جمی رہتی ہیں۔ وہ خیالات کی وادیوں میں اکثر ادھر ادھر نکل جاتا ہے لیکن ہر مقام سے اصل منزل کی طرف راہ نکال لیتا ہے۔ اگر مولانا روم کے متعلق:

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

(وہ پیغمبر تو نہیں لیکن اپنی بغل میں ایک کتاب رکھتا ہے)

کہا جاسکتا ہے تو اقبال کا اپنا مصرعہ اقبال پر اس سے بھی زیادہ صادق آتا ہے:

کلیمے ہیں کہ ہم پیغمبری ہم شاعری کردہ

(اس کلیم کو دیکھ پیغمبری بھی کی اور شاعری بھی کی)

اگر چہ اقبال خود تسلیم کرتا ہے:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں — کبھی سوز وساز رومی کبھی پیچ وتاب رازی

لیکن اقبال کا تصور کائنات صرف پیر رومی کے گائے ہوئے نغمۂ تصوف کی صدائے بازگشت نہیں ہے بلکہ اس کا نکتہ نگاہ رومی کے ایمان ووجدان اور نطشے کی مجذوبیت کے بین بین نظر آتا ہے۔ اقبال نے زمین شعر میں جو گل کھلائے ہیں اگر ان کے متعلق محض یہ کہہ دیا جائے کہ وہ رومی کے گلشن خیال سے لیکر زیب دئے گئے ہیں تو بجا نہ ہوگا یہ ہیرے اگرچہ رومی کے معدن دماغ سے نکلے ہیں لیکن تراش اقبال کی ہے اور تراش ہیرے کی خوبصورتی کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی اسکی تخلیق:

ان بنیادی تصورات کی بنا پر سمعی معلومات اسی نکتہ نگاہ سے اس کے دماغ میں اترتی ہیں۔ اسی نکتہ نگاہ سے وہ آثار کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور نتائج اخذ کر کے ایک ہمرنگ نقشہ تیار کرتا ہے۔ اور جب اس نقشے کو اپنی بصری اور فوادی طاقتوں کے معیار پر پرکھتا ہے۔ تو اس کا بنیادی تصور کائنات بجائے نقل کے اختراع وایجاد کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اور جہاں اس کی عقل دور بین وحقیقت شناس رومی کی تسبیح وتصوف میں وحدت کا رشتہ ڈھونڈتی پھرتی ہے وہاں موجودہ زمانے کے تجربات اور جدید احساسات سے متاثر ہوکر وہ چند قدم پر رومی سے آگے بھی نکل جاتا ہے۔ کائنات ساکن نہیں، متحرک بلکہ آتشیں ہے۔ دنیا ہر لحظہ بدلتی ہے ضمیر وجود نئے نئے سانچوں میں ڈھلتا ہے۔ پرانی تقدیریں بدلتی ہیں اور عالم اشیاء میں ہر وقت انقلاب اور رستاخیز برپا رہتی ہے۔ آدم خاکی کے ہنگامہ ہائے شوق مکاں ولامکاں کو نئے نئے ولولوں سے بھرتے رہتے ہیں۔ بیاضِ امکان سے ہر وقت نئے اوراق نکلتے ہیں۔ اور خامۂ قضا ہر لحظہ تقدیرِ تازہ کی تالیف میں کمر بستہ نظر آتا ہے۔ پرانے ستارے ٹوٹ کر گرتے ہیں اور پرانے ستاروں کی بجائے نئے ستاروں کی تخلیق ہوتی ہے۔ تغیر کے سوا کسی چیز کو ثبات نہیں۔ ہر لمحہ پردۂ وجود چاک ہوتا ہے حسن ازل کی نمود ہوتی ہے۔ عالم آب وخاک اسی حسن کی شعاعوں سے روشن رہتا ہے لیکن ہنگامۂ عالم کی گرمی صرف نفس آدم سے ہے جس کی تخلیق پر مہر ومہ زمین وآسمان لرز جاتے ہیں کہ صاحب نظر اور خونیں جگر منصۂ شہود پر آ گیا ہے۔ یہ کائنات، چاند، تارے، مرغ وماہی سب تماشائی ہیں:

ضروری ہے کہ ایسی کائنات کا تصور بھی متحرک ہو۔ اور ہر لحظہ ندرتِ فکر وعمل کا حامل رہے کیونکہ :

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود  کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ان افکار تازہ سے عالم شش جہات کی تخلیق وتجدید ہر لحظہ ممکن ہے۔ جہانِ چار سو رنگ وبو

کے علاوہ بھی جہان ہیں ستاروں سے ماروا بھی ایک کائنات ۔ ماورا اس کائنات سے اور بھی کوئی اور کائنات ہے۔ منزل ماہ سے آگے بھی منزل ہے:

زشرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے  سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

(میں شرر سے ستارے کا سراغ لیتا ہوں اور ستارے سے آفتاب کا۔ مجھے منزل کی پرواہ نہیں ہے۔ کہ ٹھہرنا میرے لئے باعث موت ہے۔)

انسان اس وقت تک عالم اکبر نہیں ہے ۔ جب تک کہ وہ اس عالم اعتبار سے آگے نہ نکل جائے ۔ جہاں وقت کی نبضیں رک جاتی ہیں زمان ومکان کے سوا اعتباری تصورات ختم ہو جاتے ہیں جہاں کاملیت اور ابدیت کے سوا باقی تمام احساسات بے معنی ہیں ۔ اور جہاں علم کا حجاب چاک ہوتا ہے ۔ اس وقت انسان سراسر موضوعی عینیت کا سرچشمہ ہوتا ہے ۔ وہ حقیقت ازلی کو روبرو ہو کر دیکھتا ہے ۔ وہ اپنی ہستی کو ازلی نور کی ایک شعاع تصور کرتا ہے ۔ قدرت کے باقی مظاہر اس نور ازلی کے مقابلے میں نظر نہیں آتے ۔ اس وقت وہ عناصر کی قیود سے آزاد ہو کر تخلقو ا باخلاق اللہ کا مظہر بن جاتا ہے ۔ قطرہ اور دریا ایک ہو جاتے ہیں ۔ اس کی ہستی اب قطرے کی نہیں دریا کی ہوتی ہے لہذا اس کے لئے اب دریا کا وجود باقی نہیں رہتا وہ خود دریا ہے۔

رومی اور اقبال دونوں کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصود مطلق اس حقیقت ازلی کا وجدان یا شعور ذات حق ہے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس حقیقت کا وجدان عقل واستدلال کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ فخر الدین رازی نے تشریح کرنے کی کوشش کی ۔ ہمارا علم کلی نہیں جزوی ہے ۔ زندگی اور کائنات کے متعلق ہماری تمام تر قدریں اعتباری ہیں ۔ فلسفے میں تمام اشیاء کے علم کی بنیادیں محسوسات پر رکھی گئی ہیں ۔ جن میں سے بعض مسائل آثار اور علامات کے ذریعے معلوم کئے جاتے ہیں اور بعض نتائج دلائل وبراہین سے اخذ کئے جاتے ہیں ۔ ہمیں صرف حواس کی دولت حاصل ہے ۔ ہم اس بت خانہ خاکی سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے ۔ ہماری عقل حقیقت ازلی کا تصور اپنے معیار کمال کے مطابق کرے گی ۔ اگر کوئی شخص سبز رنگ کے چشمے پہن کر دیکھے گا تو اسے ہر چیز سبز نظر آئے گی جب تک ہماری آنکھوں پر زمان ومکان کے چشمے لگے ہوئے ہیں ہم ہر چیز کا تصور زمان ومکان کے اعتباری احساسات کی بنا پر ہی کریں گے ۔ اور مطلق کو مقید کر دیں گے ۔ ہمارا مادہ پرست دماغ جو محض تاریکی ہے جمال حقیقی کو اپنے اندر عکس انداز نہیں کر سکتا:

چشم او از آنسوئے افلاک نورش ہم نیافت  کز خیال مہر و مہ اندیشہ گرد آلود بود

(اس کی آنکھ آسمانوں میں اس کا نور نہ دیکھ سکی کہ مہر و ماہ کے خیال سے اس کا اندیشہ گرد آلود تھا)

ہماری عقل اور ہماری نظر زمان و مکان میں الجھی ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت مطلق جس کا وجدان ہمارا مقصود ہے۔ زمان و مکان، فوق و تحت، تعین و تشخص بلکہ اطلاق کی قید سے بھی مبرا ہے۔ چنانچہ مولانا روم استدلال کو اس حقیقت کے وجدان کے لئے بے قاعدہ اور عقل کو نارسا خیال کرتے ہیں:

گر ز استدلال کار دیں بدے  فخر رازی رازدار دیں بدے

پائے استدلالیاں چوبیں بود  پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

(۱) اگر دلیل عقلی اور استدلال سے دین کا کام ہوسکتا تو فخر الدین رازی، رازدارِ دین بن گئے ہوتے]۔[ (۲) استدلال کرنے والوں کا پانو لکڑی کا ہوتا ہے اور لکڑی کا پانو سخت بے تمکین ہوتا ہے۔]

اس حقیقتِ مطلق کا وجدان صرف مکاشفہ اور الہام کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ یہ مکاشفہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک انسان اپنے تمام تخیلات کو صرف حقیقت کے تصور پر مرکوز کر کے باقی تمام احساسات کو یک قلم دماغ سے نہ نکال دے جب انسان تمام خیالات کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں ایک خاص قسم کے تاثر کی نمود ہوتی ہے۔ اسی جذبے کو اقبال عشق کا نام دیتا ہے۔

اگر چہ اسلامی فلسفہ و تصوف میں ویدانت کا وحدت وجود کا مسئلہ بھی کسی نہ کسی طرح شامل ہوگیا ہے۔ اور رومی کے زمانے میں یہ تمام تصورات تمام اسلامی دنیا میں پھیل چکے تھے۔ اور دینیات تک میں یہ بحثیں جاری تھیں۔ فلسفہ اور استدلال یہاں تک ترقی کر چکا تھا کہ افکار کی ایک عظیم الشان ثروت رومی کے پیش نظر تھی لیکن وہ فلسفہ بحث میں نہیں پڑتا نہ ہی وہ استدلال کی پرواہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ حقیقت کے متعلق قابل قدر وجدان رکھتا ہے۔

قرآن کے معارف رومی کی نظر میں روشن تھے۔ وہ خالص اسلامی نظریہ حیات اور فکر و عمل کے اسلامی تصورات سے پوری طرح واقف تھا۔ دوسری طرف یونانی فلسفے کے ایسے تصورات بھی پیش نظر تھے جن میں اسلامی مفکر کے لئے کچھ نہ کچھ صداقت موجود تھی۔ لہذا رومی کے سامنے حکمت قرآن اور خالص استدلال دونوں کا خزانہ موجود تھا۔ لیکن رومی بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ استدلال کی حدیں

کہاں تک ہیں۔

اقبال نے بھی جدید فلسفہ اور یورپ کے مختلف استدلالی مسائل کا بغور مطالعہ کیا تھا۔اس کے سامنے معقولات کا ایک بے پایاں سمندر موجود ہے۔لیکن جب وہ پیر رومی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو وجدانیت کا سیلاب اس کی معقولات کی تمام طاقتوں کو بہا کر لے جاتا ہے اور زور عمل کی تلقین' زور فکر کی تلقین پر غالب آجاتی ہے۔

رومی کے عہد میں فارسی شاعری میں راہبانہ تصوف بہت ترقی کر چکا تھا۔فارسی کے تمام بڑے بڑے مفکر اور شاعر وحدت وجود اور وحدت شہود کے تصورات اور جبر وقدر کے فکری مسائل میں الجھے ہوئے تھے کہ انسان کے تمام اعمال پہلے ہی سے مقرر ہیں۔جو خیر وشر کے افعال انسان کی طرف سے سرزد ہوتے ہیں وہ خدا کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔اور کیونکہ بغیر کلی اختیار کے اخلاقی ذمہ داری بے معنی چیز ہے۔لہذا آہستہ آہستہ نفس انسانی نے تقدیر کا سہارا لیا اور عملی روح کو کچلنا شروع کر دیا تھا۔بڑے بڑے مفکر زندگی کے متعلق صرف فکری نظریات پر اکتفا کرنے لگے۔لیکن مرد مومن کے لئے دل ودماغ دونوں کی ضرورت ہے۔فکر ونظر دونوں مل کر انسانی ہستی کی تکمیل کرتے ہیں۔نطشے کے پاس دماغ تھا۔مگر وہ دل کی دولت سے محروم رہا۔اس نے مقام آدمیت کی تلاش میں مقام کبریا کو بھلا دیا اسے کوئی رہبر کامل نہ ملا۔اور وہ اپنے آپ میں گم ہو کر رہ گیا یہی انجام ہر اس مفکر کا ہوا جس کے تصور کائنات کی نمود صرف فکری قوتوں سے ہوئی۔رومی کے تصور کائنات میں سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ وہ حقیقت ازلی کا وجدان عقل واستدلال سے نہیں بلکہ ایک ایسے جذبے کی بدولت حاصل کرنا چاہتا ہے۔جو انسان کے دل میں پیدا ہو کر اس ساز کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ان تاروں سے آواز دوست سنائی دینے لگتی ہے۔اس جذبے کو اقبال اور رومی دونوں عشق کا نام دیتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان کے خیال میں عشق دماغ کا خلل نہیں ہے۔بلکہ تمام کائنات کی روح ہے۔ازل کے نکتہ دیرینہ کی تمہید ہے۔ذروں سے لیکر صحرا تک کے تمام باہمی نظام صرف اسی جذبے کی وجہ سے قائم ہیں۔یہی وہ جذبہ ہے جس کی بدولت ہر چیز اپنے مرجع کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔عشق ہی سوز ہے عشق ہی ساز۔عشق ہی ذوق نظر اور عشق ہی طلب وتمنا' عشق خود منزل بھی ہے راہبر بھی ہے اور رہزن بھی۔رومی کے ہاں جذبہ عشق ایک جذبہ تخلیق ہے۔جذبہ تسخیر وارتقاء ہے۔جاوید نامہ میں اقبال فرماتے ہیں:

شاہدِ اول شعور خویشتن　　خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعور دیگرے　　خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذات حق　　خویش را دیدن بنورِ ذات حق

(۱) پہلا شاہد خود اپنا شعور ہے۔ یعنی اپنے آپ کو اپنے نور سے دیکھنا۔
(۲) دوسرا شاہد دوسرے کا شعور ہے۔ یعنی اپنے آپ کو دوسرے کے شعور سے دیکھنا۔
(۳) تیسرا شاہد ذاتِ حق کا شعور ہے یعنی اپنے آپ کو ذاتِ حق کے نور سے دیکھنا۔

یعنی انسان کے لئے اس حقیقت ازلی کا وجدان حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنی ہستی کو پہچاننا لازمی ہے۔ اس کے بعد انسان کسی رہبر کامل کی ہستی کا شعور حاصل کرے۔ اور اس کی روشنی میں اپنے وجود کا اعتباری مطالعہ کرے۔ اس کے بعد جا کر تیسرے مرحلے پر ذات حق کا شعور ہوگا۔ اور انسان نور ازل کی روشنی میں اپنی ہستی کا پھر مطالعہ کریگا۔ خداشناسی سے پہلے خودشناسی لازمی ہے۔ رسول پاک کی ایک حدیث ہے کہ من عرف نفسه فقد عرف ربّه (جس کسی نے اپنی ہستی کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا) انسانی عقل کی فتوحات بھی کم نہیں ہیں لیکن:

عقل آدم بر جہاں شبخوں زند　　عشق او بر لامکاں شبخوں زند

(انسانی عقل جہاں پر شب خون مارتی ہے جبکہ عشق لامکاں پر شب خون مارتا ہے)

کہیں اس کی ضربوں سے کہسار چور　　کہیں اس کے پھندوں میں جبریل وحور

مولانا روم کے ایک قطعہ میں اسی مرد کامل کی طرف اشارہ ہے جس نے خودشناسی کی منزل طے کی ہو:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دو ملولم و انسانم آرزو ست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستمِ دستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نشود جُستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست

(۱) کل رات میں چراغ لے کر شہر بھر میں گھومتا رہا کہ میں جانوروں سے مل کر ملول ہوں

اورانسان سے ملنے کی آرزو ہے۔

(۲) ان ست الوجود ہمراہیوں سے دل گرفتہ ہوں اور شیر خدا اور رستم زماں کی آرزو ہے۔

(۳) میں نے کہا کہ جو نہیں ملتا ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہاں ایسے ہی نہ ملنے والے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

اور اسی مرد کامل کو اقبال ایک گونہ خدا سے بھی برتر سمجھتا ہے:

خدائی اہتمام خشک وتر ہے
خداوندا خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ دردسر نہیں درد جگر ہے

اسی درد جگر اور ذوق مجبوری کی بدولت انسان حور وفرشتہ سے بھی بڑھ کر ہے بلکہ مقام بندگی شان خداوندی سے بھی بڑھ کر ہے:

گرچہ ما مرغان بے بال وپریم
از خدا در علم مرگ افزوں تریم

اگرچہ ہم مرغان بے بال پر ہیں لیکن علم مرگ میں خدا سے بڑھ کر ہیں۔

یہاں تک کہ اقبال کے نزدیک خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ لیکن آخر جب انسان نے اپنی ہستی کا راز پالیا تو اس نے خدا کو بھی اپنی صورت پر ڈال لیا:

تراشیدم صنم بر صورت خویش
بہ شکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتن محال است
بہ ہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

(ہم نے بت بھی اپنی شکل پر تراشے ہیں۔ اپنی شکل پر خدا کا نقش بھی بنایا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے باہر نکلنا محال ہے۔ جس رنگ میں بھی ہوں میں خود پرست ہوں۔)

حقیقت ہے کہ رومی جہاں اپنے خیالات میں توازن پیدا کر کے سلجھ گیا ہے۔ اقبال کی تڑپ اور آرزوئے طلب اسے اس طرح بے تاب کر دیتی ہے کہ وہ خدا سے راز ونیاز کی صورت میں یوں

شوخیاں کرنے لگتا ہے کہ اکثر اس کے تصور ربوبیت پر شک ہونے لگتا ہے:

خود بگو ایں جا چساں آسودہ ای
سالہا محکوم یزداں بودہ ای

(یہ بتلا کہ یہاں کس طرح آسودہ ہے اور سالہا سال سے محکوم یزداں ہے)

اسی طرح رومی کا وجدانی جوش بھی جب اسے ابھارتا ہے تو وہ بھی کہہ گزرتا ہے:

فرشتہ صید وپیمبر شکار ویزداں گیر

(فرشتہ کو صید بنانے والا' پیمبر شکار اور یزداں کو پکڑنے والا)

ارتقا کی ان تمام منازل کے لئے وہی عشق کا جذبہ اپنے تمام شدید احساسات کے ساتھ خضر راہ کا کام دیتا ہے۔ اور جہاں جبرئیل بھی صید زبوں سے زیادہ نہیں اقبال یزداں پر بھی کمندیں ڈالنے لگتا ہے۔ تو یہی عشق کا جذبہ فضا کے بے پناہ پیچ وخم میں آگے لے جاتا ہے **فخلق کل شی فقدرہ تقدیرا** کی یہ تفسیر نہیں ہے کہ تقدیر میں جزوی طور پر اعمال افراد سے پہلے خدا نے معین کر دیئے ہیں۔ بلکہ اقبال کے نزدیک تقدیر آئین حیات کا نام ہے۔ تقدیر اس حیات انسانی کی تفسیر ہے جو پیہم دواں اور ہر دم جواں ہے۔ جس کی وسعتیں امروز وفردا کے احساسات سے ماروا ہیں:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

پس تقدیر اس ضابطہ قانون کا نام ہے جس کے ماتحت ایسی زندگی کا پروگرام چلتا رہے گا۔ جس کا جوہر تخلیق وتجدید ہے۔ لہذا ایسی تنوع پذیر زندگی کا قانون یا پروگرام وہ چیز نہیں ہوسکتی جو تبدیلی اور تلون سے یک قلم مبرا ہو۔ اقبال انسان کو خدا اور اس کی تقدیر کے ہاتھ میں کھلونا نہیں سمجھتا۔ بلکہ وہ ایک ایسے آدم کی تعمیر ممکن خیال کرتا ہے:

پھونک ڈالے یہ زمین وآسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اگر آدمِ خاکی بدل جائے تو اس حیرت خانہ امروز وفردا کی حقیقتیں بدل جائیں۔ حرف

تقدیر بدل جائے۔ اقبال کے خیال میں زندگی کا کوئی ایسا نقشہ جو پہلے ہی سے تیار کر کے لوح محفوظ میں رکھ دیا گیا ہو موجود نہیں ہے۔ سلسلہ ہستی کی [illegible] ن کی ارتقائی منازل ہیں۔ وہ جوں جوں اپنے جذبہ عشق کے زور سے قوت عمل پیدا کرتا ہے [illegible] یہ منازل خود بخود تیار ہوتی جاتی ہیں۔ خودی کا علمبردار اقبال جس کا جنون حور و فرشتہ اور [illegible] تک کو شکار کرنے کی سوچتا ہے۔ مہر و مہ پر کمندیں ڈالتا ہے۔ موجوں کو سینہ دریا سے توڑ کر الگ کر دیتا ہے۔ وہ اس تقدیر کا کہاں قائل ہوسکتا ہے:

چوں از تو کارنادر کار آید
گناہے ہم اگر باشد صواب است

اگر تجھ سے کوئی کارنامہ ہوتا ہے اگر وہ گناہ بھی ہے تو صواب ہے

اکثر مفکروں کے خیال کے مطابق انسان اپنے اعمال کے بارے میں پابہ زنجیر ہے۔ لیکن اقبال نے تقدیر کے مسئلے کی یہ تفسیر کی ہے کہ بندہ مومن خود تقدیر الٰہی ہے۔ اس مرحلے پر حرف تقدیر اور مرد مومن کے اعمال میں مکمل تطبیق ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھ لیں کہ:

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جب تک انسان تقدیر و تدبیر کے جھگڑوں میں الجھا رہے وہ صحیح معنوں میں مرد مومن نہیں ہوتا اور جب وہ ان جھگڑوں سے بالاتر ہو جاتا ہے تو:

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

اور جب وہ خاکی عناصر سے آزاد ہے تو مجبور تقدیر کے کیا معنی؟ اس وقت وہ دیکھنے میں قاری ہے۔ لیکن وہ حقیقت میں قرآن ہے۔

اقبال اپنے آپ کو پیر رومی کا مرید تصور کرتا ہے۔ چنانچہ مثنوی اسرار و رموز کے اسلوب بیان اور طرز ادا میں مثنوی معنوی کا رنگ جھلکتا ہے۔ جاوید نامہ میں جب تمہید آسمانی شروع ہوتی ہے تو عارف رومی کی روح اقبال کو معراج انسانی کے اسرار و رموز سمجھاتی ہے اور رومی کے گائے ہوئے نغمہ تصوف سے مست ہو کر زندہ رود کو بھی مجبور نوا ہونا پڑتا ہے۔ رومی ہی یہاں موجود و ناموجود اور شعور ذات حق کے ارتقائی مراحل کی حقیقت اور **تخلقوا باخلاق اللہ** کا راز

فاش کرتا ہے۔ پھر اقبال پر اسرار حیات کھولے جاتے ہیں:

برمقام خود رسیدن زندگی ست
ذات را بے پردہ دیدن زندگی ست
چشم برحق باز کردن زندگی ست
خویش را بے پردہ دیدن زندگی ست
چیست معراج آرزوئے شاہدے
امتحانے رو بروئے شاہدے
آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

اسی طرح فلک قمر میں بھی عارف رومی مرید ہندی کی راہبری کرتا ہے۔ اسے حقیقتِ پیغمبری سمجھاتا ہے۔ پیچ وتاب رازی سے نکال کر عشق کا سوز وگداز اور نور جاں بخشتا ہے یہ سب کچھ ہے۔ لیکن مرید ہندی کا مذہب پیر رومی کی اندھا دھند تقلید کرنا نہیں ہے۔ جس ہستی کا جوہر تخلیق ہے تقلید اس کے لئے خودکشی ہے۔ جہاں مولانا روم نے تقلید کی برائی میں عجیب وغریب حکایتیں تراشی ہیں۔ وہاں اقبال نے تقلید کو نفس خودی کے لئے زہر قرار دیا ہے۔ حقیقت ازلی کے وجدان کے لئے خودی کا اثبات ضروری ہے۔ اور تقلید اس وجدان کے لئے زہر۔ تجدید وتخلیق کے دروازے اس فرد اور قوم پر بند ہو جاتے ہیں۔ جو تقلید پر ایمان رکھتی ہے۔ تقلید کی روش آئین جدوجہد کے خلاف ہے۔ اور جدوجہد سے بچنے کے لئے انسان مشکلات زندگی سے گریز کرتا ہے۔ اقبال اس فلسفہ ٔ قنوطیت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ وہ مشکلاتِ زندگی کو دعوت دیتا ہے۔ بلکہ اپنے اوپر عائد کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر ان پر حاوی ہونے میں کمال انسانیت تصور کرتا ہے۔ یہ مشکلات زور پرواز آزمانے کے لئے دعوت عمل دیتی ہیں۔ صحیح عناصر کا انسان پیکارِ حیات سے خوش ہوتا ہے۔ جب طوفان کی موجیں ذرا سست خرام ہونے لگتی ہیں۔ وہ سینہ بحر سے نئے طوفان اٹھانے کی سوچتا ہے۔ وہ ساحل سے اس رزم گاہ کا تماشہ نہیں کرتا۔ بلکہ دریا کی موجوں سے لپٹ جاتا ہے۔ ناکامی میں آہ وفغاں اور بے کسی میں نالہ وزاری اس کا شیوہ نہیں ہے۔ وہ ایسی کائنات میں جینا چاہتا ہے جہاں امتحان عقل ودیں کے لئے کسی زبردست ابلیس سے برسر

پیکار رہنا پڑے۔ اس کی جان بے یقینی سے لرزہ براندام نہیں ہوتی۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا موت اس کے لئے زندگی کے سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی ہے۔ وہ صرف ترکِ فکر، ترکِ ذکر اور ترکِ عمل کو موت سمجھتا ہے۔ پیچھے کی طرف حرکت کرنا جمود سے بہتر ہے:

کافرے بیدار دل پیش صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

(کوئی کافر بیدار دل صنم کے آگے اس دیندار سے بہتر ہے جو حرم میں سو گیا ہے۔)

نقش گرِ ازل نے حیات انسان کا نقش جان بوجھ کر نامکمل تخلیق کیا ہے اور پھر اسے ایک ایسی تڑپ اور تپش عطا کر دی ہے جس کی بدولت وہ فروغ جاوداں حاصل کرنے کی سعی میں مصروف رہتا ہے۔ اس کا خاکی جسم۔ عناصر کا بت کدہ اس پرواز میں حائل نہیں ہوتا:

ایں بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

یہ بدن ہماری جان کا ساتھی نہیں ہے۔ یہ مشت خاک مانع پرواز نہیں ہے۔

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا نہیں نقش حیات، بلکہ مٹ مٹ کے ابھرتا ہے۔ موجِ دریا خود ہی حبابوں کو تعمیر کرتی ہے۔ جو دم بھر میں سطح آب پر آ کر مسکراتے ہوئے ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ دست قدرت کی ناکامی پر خندہ زن نہیں ہوتے بلکہ تجدید حیات پر خوش ہوتے ہیں۔ اور تیز خرام موجوں سے مل کر وہ بھی نئے حبابوں کی تعمیر میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہر تخریب کسی تعمیر نو کا پیش خیمہ ہوتی ہے:

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
فطرت ہستی شہید جستجو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو آرزو رہتی نہ ہو

(ماخوذ از اقبالیاتِ نقوش: مرتبہ تسلیم احمد تصور)

○○○

مولانا رضوان القاسمی مرحوم

# یادداشت

## بابت

# ''میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے''

(ساؤتھ آفریقہ سے اقبال ریویو کے ایک قاری کے استفسار پر مولانا رضوان القاسمی مرحوم نے یہ نوٹ تحریر فرمایا تھا جو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے)

.....

علامہ اقبالؒ نے ''ہندوستانی بچوں کے قومی گیت'' کے عنوان سے جو نظم کہی ہے اس کا ایک مصرعہ یہ ہے:

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

(کلیاتِ اقبال، حصہ بانگ درا: ص ۷۲، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی)

اگرچہ بانگِ درا کے شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے کہ ''اس میں آنحضرت ﷺ کی حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ''مجھے ہندوستان سے توحید کی خوشبو آتی ہے'' لیکن چشتی صاحب نے جن احادیث اور آثار کو بنیاد بنایا ہے، ان میں صراحتاً ''توحید'' کا لفظ نہیں ہے، ہاں! معنی خوشبو کا لحاظ کرتے ہوئے احادیث اور آثار میں جو الفاظ آئے ہیں ان سے توحید اور ایمان کا اشارہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سید غلام علی آزاد بلگرامی کی ایک کتاب ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' کے نام سے ہے، یہ اپنے موضوع پر اہم اور وقیع کتاب ہے، اور ہندوستان کے موضوع پر لکھتے ہوئے کوئی محقق اور مورخ اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، اس کتاب کے ابتدائی صفحات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوۃ السلام جب فیصلہ خداوندی کے تحت جنت سے زمین پر

تشریف لائے تو یہ مقام ''سراندیپ'' کا تھا۔ آزاد بلگرامی اور دوسرے محققین نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے کہ حضرت آدمؑ جنت سے اپنے ہمراہ کن چیزوں کو لے کر اترے تھے، ان چیزوں میں خوشبو کی قبیل کی جن چیزوں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔عود، ۲۔صندل، ۳۔مشک، ۴۔عنبر، ۵۔کافور،

کیا عجب کہ ''ابوالبشرؑ'' سے غیبی نظام کے تحت یہ بات، ''خیرالبشرؐ'' تک پہنچتی ہو، اور آپ ﷺ نے کسی خاص موقع پر ارشاد فرمایا ہو کہ ہندوستان کی سرزمین سے مجھے خوشبو آرہی ہے، یہ خوشبو مادی اور ظاہری حیثیت کی بھی ہوسکتی ہے جس سے مشام جاں تازہ اور معطر ہوا کرتا ہے، اور ایمان وتوحید کی روحانی اور غیر مرئی خوشبو بھی ہوسکتی ہے، جو ہندوستان جیسے کفر وشرک زدہ علاقہ میں صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین اور اسلاف واکابر کے ذریعے پھیلنے والی تھی، جو پھیل کر رہی، اور بعد کے تاریخی احوال اور آثار نے اس احساس نبویؐ پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

روحانی احساس، یقین اور ایمان کی بنیاد پر ابھرتا اور اجاگر ہوتا ہے، اس کے لیے انبیاء اور روحانی شخصیتوں کی بہت ساری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، تاہم قرآن کریم میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے ذیل میں جو بیان ہوا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے کرتہ کی خوشبو بہت دور دراز مسافت سے سے انہیں آنے لگی تی، جب کہ ان کے پاس میں رہنے والے بیٹے ان کے اس احساس کو غلط قرار دے رہے تھے، تاہم ان کے اندر کا یقین بول رہا تھا کہ یہ جو کچھ میں بیان کررہا ہوں ناقابل تردید حقیقت ہے، پھر ہوا یہی کہ جو کچھ حضرت یعقوبؑ نے بیان کیا تھا وہ ہوکر رہا، اور جب حضرت یوسفؑ کا کرتہ نگاہوں کے سامنے آگیا تو ان کے ان بیٹوں نے بھی اس سچائی کے اعتراف پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔ گویا:

بُعدِ مسافت نہ بود در سفرِ روحانی

روحانی سفر میں زمان ومکان حائل نہیں ہوا کرتا، اور نبیؐ اپنی آنکھوں سے اپنے دور میں وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جسے دور کے لوگ نہیں دیکھ سکتے، نبیؐ کی پیش گوئیاں بھی اسی قبیل کی ہیں، اور بعد میں آنے والے حالات کی اطلاع بھی اسی نوعیت کی ہے۔

ان اجمالی مباحث کے بعد یہ عرض ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کرکے یہ قول نقل کیا ہے ''أطیب ریحا أرض الهند'' ہندوستان پاکیزہ

ترین خوشبو والا ملک ہے۔ (ابن عساکر بحوالہ المرجان فی آثار ہندوستان، صفحہ ۳۱)

بعض لوگوں نے اس قول کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے لیکن مشہور محقق، مورخ، اور سیرت نگار مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ

''یہ تمام روایتیں فن حدیث کے لحاظ سے بہت کم درجہ کی ہیں۔'' (عرب و دیار ہند، از مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی، صفحہ ۱۳)

آخر میں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ علامہ اقبالؒ اپنے دور میں عظیم شاعر کی حیثیت ہی سے نہیں اُبھرے تھے بلکہ ادیان و مذاہب کی تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی، وہ تاریخی شعور بھی رکھتے تھے اور تاریخی واقعات کو قرینہ اور سلیقہ سے پیش کرنے کا انہیں فن بھی آتا تھا۔ اقبالؔ نے بیشمار تاریخی واقعات کو اشعار میں اپنے گہرے فلسفیانہ شعور کے ساتھ جو سمویا ہے، وہ انہیں اپنے معاصر شعراء کے درمیان امتیاز بخشتا ہے، اور اس معاملہ میں ان کا کوئی ہم عصر ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

''میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے'' ..... اس زبردست تلمیحاتی مصرعہ سے اقبالؔ نے ہندوستان کی عظمت کو کہاں سے کہاں تک پہنچایا، ہندوستان سے متعلق جتنے قومی گیت اور ترانے ہیں وہ سب ایک طرف اور اقبالؔ کا یہ مصرعہ ایک طرف، اقبالؔ کا یہ مصرعہ باشندگان ہند کی ذمہ داریوں کو یاد دلاتا ہے کہ اس طرح سے مل جل کر رہیں کہ سب کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، اور داعیان توحید بھی اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرم عمل رہیں۔

☆☆☆☆

پروفیسر بشر احمد نحوی
ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ
کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

# پروفیسر سید سراج الدین..... چند یادیں، چند باتیں

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی اپنے یوم آغاز سے بلند پایہ شخصیات کی موجودگی اور ادارے میں ان کی خدمات سے معمور و مسرور رہا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر آنمامیری شمل، پروفیسر صبیح احمد کمال، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر محمد عبداللہ شیدا، پروفیسر محمد امین اندرابی اور مرحوم پروفیسر سید سراج الدین، اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ طویل اور قلیل مدت تک وابستہ رہے اور ان برگزیدہ، ہستیوں نے اپنے وسیع تجربات، مطالعات اور مشاہدات سے ادارے کا نام سربلند کرنے میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا۔ شخصیات کی اس کہکشاں میں پروفیسر سید سراج الدین (حیدرآباد) میرے ان کرم فرما بزرگ دوستوں میں سے تھے، جنہیں پروفیسر سرور مرحوم نے توسیعی خطبات مرحمت فرمانے کے لیے کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ سال ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ سراج صاحب چند مہینوں کے لیے کشمیر تشریف لائے۔ میں ان دنوں ''تصوف اور اقبال'' کے موضوع پر مواد اکٹھا کر رہا تھا۔ سید صاحب بنیادی طور پر انگریزی ادب کے استاد تھے، لیکن فارسی اور اردو ادبیات پر ان کی گہری نظر کا مجھے اس وقت اندازہ ہوا، جب آپ نے رسالۂ قشیریہ سے لے کر ابواللیث صدیقی کی کتاب اقبال اور مسلک تصوف، تک درجنوں کتابوں کے نام ان کے مصنفین سمیت دہرائے جو میرے موضوع سے تعلق رکھتی تھی۔ ۲/اکتوبر ۱۹۸۵ء کو ہم ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کی ایک ڈیلکس بس سے انسٹی ٹیوٹ کے جملہ محققین کے ہمراہ پکنک پر پہلگام گئے، یہ ایک یادگار دن تھا جب سرور صاحب اور سراج صاحب جیسی سربرآوردہ شخصیتوں کی معیت میں مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونے کا ہمیں موقع فراہم ہوا۔ دن بھر مناظر و مظاہر کے حوالے سے

ہم نے بیت بازی کی اور مجھے یاد آرہا ہے کہ جب میں نے عرشؔ ملیسیانی، چکبستؔ لکھنوی، شمیم کرہانی اور عابدؔ مناوری کے وہ اشعار سنائے جو کشمیر کے حوالے سے لکھے گئے ہیں، تو سراج صاحب نے داد وتحسین کے ایسے جملے دہرائے، جواب بھی میرے لوحِ ذہن پر محفوظ ہیں۔ سید سراج الدین صاحب نے پہلگام کی رنگینی اور رعنائی سے متاثر ہوکر لدّرؔ کے کنارے گھومتے گھومتے کہا کہ ''کاش ولیم وارڈس ورتھ ایک بار ان مناظر کو دیکھتا ان کی فطرت شناس شاعری کا حلیہ ہی بدل گیا ہوتا۔''

پروفیسر سراج صاحب کی نرم مزاجی، نازک خیالی، سادگی، خداترسی اور اقبال کے ساتھ ان کی بے پناہ وابستگی مجھے ان کی طرف روز بروز مائل کرتی ہیں چنانچہ ہم شام کے اوقات میں ڈل جھیل کی سیر کرنے اور لال چوک کی گہما گہمی کی مشاہدہ کرنے ایک ساتھ جاتے تھے۔ ایک دن ریگل چوک سرینگر میں مشروبات کی دکان پر میں نے سراج صاحب کو مینگوشیک کا ایک بڑا گلاس پلایا، چنانچہ مرحوم کئی دن تک شدتِ تمازت میں نوش کئے اس مشروب کا شکریہ آدابِ کلام کے جملہ محاسن کے ساتھ کیا کرتے تھے اور دوسری بار مغل دربار ریستوران میں مرغ اور نان تناول فرما کر سراج صاحب اس قدر ممنون رہے کہ مناظر قدرت، مہمان نوازی اور خطۂ گل کے لوگوں کی دلربائی کا ذکر کرتے ہوئے عرفیؔ کا یہ شعر بار بار دہراتے تھے۔

کاں سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است بے بال و پر آید

سید سراج الدین مرحوم ایک بار میرے ساتھ مغل باغات دیکھنے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پرانی اینٹوں، پتھروں، سبزہ زاروں اور چناروں کو دیکھ کر ان کا اندازِ گفتار دیوانگی کی حدوں تک چلایا گیا۔ سراج صاحب کی زندگی کے اس پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعیم الدین پروفیسر معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی نے سید سراج الدین کی وفاتِ حسرت آیات پر اپنے تاثراتی نوعیت کے مضمون میں لکھا ہے

''سراج صاحب ایک اچھے آرٹسٹ بھی تھے۔ ان کو قدرتی مناظر، درخت، پہاڑ، پرانی عمارتوں کی تصویر کشی بڑی پسند تھی۔ ان کی اپنی بنائی ہوئی چند تصاویر کو انہوں نے اپنے دیوان خانے میں لگا رکھا تھا۔ ایک ایسے آدمی کہ جس نے مصوری باقاعدہ نہ سیکھی ہو، اتنی اچھی تصاویر بنانا

حیرت انگیز تھا۔ ان کی پسندیدہ تصویر ایک چھوٹی ٹوٹی پھوٹی پرانی مسجد کی ہے، جو انہوں نے بہت پہلے بنائی تھی اور اس کو محفوظ رکھا تھا۔ مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور اچھے مناظر سے متاثر ہوتے تھے اور گھنٹوں ان میں گم ہو جاتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ سوئٹزرلینڈ کے مناظر بے حد خوبصورت ہیں مگر وہ اتنے Rich ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد آدمی ان سے چھک جاتا ہے، ہمارے مناظر سے دل کبھی نہیں بھرتا۔''

پروفیسر سراج صاحب کا قیام کشمیر اگرچہ چند مہینوں کا تھا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ساتھ میرے مراسم کئی عشروں سے قائم و دائم تھے۔ ہر قدم پر حوصلہ افزائی، رہنمائی، علمی فراخدلی، عالی ظرفی اور مروت کا مظاہرہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ ریاکاری، مداہنت اور نخوت سے کوسوں دور یہ شخص اقبال کے الفاظ میں ''مسلماں کے لہو میں ہے۔ سلیقہ دلنوازی کا''، عملی نمونہ اور بقول ایک اور شاعر ''ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں'' کا بین ثبوت تھا۔ سراج صاحب سے اپنی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے جید نقاد شمس الرحمان فاروق صاحب نے بہت خوب لکھا ہے اور بجا لکھا ہے۔

''سراج الدین صاحب نے صرف یہ کہ اپنے علم کی نہیں نمائش کرتے تھے بلکہ وہ صحیح معنی میں منکسر المزاج تھے اور اس سے بڑی بات یہ کہ دوستوں کا لحاظ اور دوستوں کی خوبیوں کا احترام بھی ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ لہذا وہ دوستوں کی تحریروں کے شائق رہتے اور انہیں کھل کر داد دیتے تھے اور اپنے بارے میں کسی سے توقع نہ رکھتے تھے۔ یہ وسیع النظری اور پاس مروت اب ہمارے لکھنے والوں میں تقریباً نایاب ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کی قدر نہیں ہوئی یا توقع ہے سے کم ہوئی۔ لیکن ان کی کسی بات سے یہ تاثر نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ کے متوقع تھے، یا جیسا کہ آجکل اکثر لوگوں کا شیوہ ہے۔ انہیں معاصرین سے ناقدردانی کی شکایت کبھی نہ ہوئی۔ ان میں ایک طرح کی درویشی اور بے نیازی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ سرچشمی اور فیاضی بھی ان کے مزاج میں بہت تھی۔ ''شب خون'' کی محفلوں میں وہ بہت دیر میں شریک ہوئے۔ لیکن انہوں نے اکثر کہا اور لکھا بھی کہ ''شب خون'' میں اشاعت کے باعث ان کے پڑھنے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ خصوصاً شمال ہند اور بیرون ملک میں زیادہ تر لوگ انہیں ''شب خون'' کے حوالے سے جانتے تھے۔ یہ ان کا کہنا تھا اور میں ان سے ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ آپ کی تحریروں کے باعث علمی

حلقوں میں ''شب خون'' کی قدر بڑھی ہے۔''

مجھے ۳۱/اکتوبر ۱۹۸۵ء کی وہ ادبی نشست یاد آرہی ہے جو سرور صاحب مرحوم نے سراج صاحب کے اعزاز میں آراستہ کی تھی اور جس میں یونیورسٹی کے نامور اساتذہ کو مدعو کیا گیا تھا۔ محفل میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے محققین، اساتذہ، سرور صاحب اور دیگر شعبوں کے علم دوست حضرات موجود تھے۔ علمی وادبی تقاریر سے فراغت کے بعد سید سراج الدین نے ایک آزاد نظم سنائی، جس میں انسٹی ٹیوٹ کے اسکالروں، پروفیسر آل احمد سرور کی شخصیت کی رعنائیوں اور سید سراج الدین کی کشمیر سے دلچسپیوں کا ذکر خیر کیا گیا تھا۔ محفل میں نظم کو کافی سراہا گیا اور خوش قسمتی سے اب تک وہ پوری نظم میرے حافظے میں محفوظ ہے اور پہلی بار سپرد قلم بھی ہو رہی ہے۔ مرحوم سراج صاحب یوں رطب اللسان ہوئے۔

چند نوجواں،
میزوں، کتابوں اور الماریوں کے درمیاں
کچھ لڑکیاں
رفتار میں سرو کارواں
گفتار میں شریں بیاں
لوح وقلم کی پاسباں
اور ان سب سے الگ
اک میز پر، اک پیرِ دانا
ایک مرد معتبر، علم کے ہر پیچ وخم سے باخبر
جس کی آنکھوں میں ہے شعلہ عشق کا
جس کے بالوں میں ہے پیری کا دھواں
خوش طبیعت، خوش بیاں
پیرانہ سالی میں جواں
میں نے بھی گردش میں لائے ہیں یہاں جام وسبو
رندوں سے کی ہے دوستی، شیخوں کی صحبت میں عیاں

ہیں کہ وابستہ دکن کی خاک سے اے میری جاں
وہ چٹانوں کی زمیں
وہ آم اور املی کا دیس
وہ مروت کا نشیمن، وہ دیارِ دوستاں
یاد رکھنا، [1] اے کشیر، اے وادیٔ جنت نشاں

کشمیر میں نامساعد حالات کے سبب اقبال انسٹی ٹیوٹ کا رابطہ بڑی حد تک معروف علمی شخصیات سے منقطع ہوکر رہ گیا تھا، لیکن خدا کے فضل سے گذشتہ پانچ چھ برسوں میں سمیناروں، اور توسیعی خطبوں کے سلسلے میں ہم نے کئی اصحاب علم و دانش کو سرینگر بلایا اور ان سے مقالات پڑھوائے اور توسیعی خطبات دلوائے۔ گذشتہ سال جولائی کے مہینے میں دوروزہ بین الاقوامی سمینار کے انعقاد کا ہم نے پروگرام مرتب کیا تھا اور اس سلسلے میں ٹیلیفون پر سید سراج الدین صاحب سے بھی رابطہ قائم کیا تھا۔ اپنی شیرین اور ملائم زبان میں سید صاحب نے کشمیر آنے کی دعوت قبول کرلی تھی اور وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ آنے کی خواہش بھی ظاہر کرچکے تھے۔ میں نے ان کے لیے اپنے ایک دوست کے ہاؤس بوٹ میں قیام کا انتظام بھی کرادیا تھا، چنانچہ چند نامساعد حالات کے پیش نظر یہیں وہ سمینار التوا میں رکھنا پڑا اور التوا کی یہ اطلاع ہم مدعو مہمانوں کو بذریعہ ٹیلیفون ارسال کررہے تھے کہ میں نے سراج صاحب کے فون نمبر پر رابطہ کیا اور ان کے گھر پر ایک خاتون نے یہ دردانگیز خبر سنائی وہ، داعی اجل کو لبیک کہہ گئے ہیں ۔

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِّ مجبوری عیاں
خشک ہوجاتا ہے دل میں اشک کا سیل رواں

یہ خبر سنکر میں اشکبار ہوگیا، لیکن ایک اطمینان کا سامان میرے پاس موجود تھا کہ مرحوم سراج صاحب نے ڈاکٹر نذیر احمد شیخ سینئر لکچرار اردو ڈگری کالج بائزبار ہمولہ کے ہاتھ ایک نادر تحفہ عنایت فرمایا تھا اور وہ ہے اقبال کے جاوید نامہ کا منظوم آزاد ترجمہ۔ آپ نے اپنے ایک خط میں جو اسی مسودے کے ساتھ شامل تھا، یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس ترجمے کو اقبال اکیڈیمی

(۱) کشمیر کو 'کشیر' کے نام سے پڑھا جاتا ہے

حیدرآباد کے مالی اشتراک سے شائع کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ راقم نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالواحد قریشی کو اس نادر ترجمہ کی اشاعت کے بارے میں ایک نوٹ پیش کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ جاوید نامہ کا یہ منظوم ترجمہ بحسن وخوبی زیور کتابت وطباعت سے آراستہ ہونا چاہئے اللہ کا شکر ہے کہ کمپوزنگ کے مرحلے سے نکل کر عنقریب یہ کتابی شکل میں شائع ہورہا ہے اور شیدایان ادب اس کتاب سے مستفید ومحظوظ ہونگے۔ *

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی خالصۃً ایک تحقیقی ادارہ ہے اور اس میں آج تک پچاس اسکالرز ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں مختلف عنوانات پر تحقیقی کام انجام دینے کے حوالے سے حاصل کرچکے ہیں۔ فکری اور فنی موضوعات پر مقالات لکھنوانے کے ساتھ ماہرین اقبالیات کی شخصیت اور خدمات پر بھی ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے تحریر کروائے جاتے ہیں۔ ادارے کی ریسرچ کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ لیا ہے کہ اگلے سال پروفیسر سید سراج الدین کی اقبال شناسی کے موضوع پر ایک مبسوط تحقیقی مقالہ لکھوا کر حیدرآباد کی مردم خیز بستی کے اس بطل جلیل کی خدمات کے تئیں عقیدت کا اظہار ہو اور جن پاکیزہ اور صالح قدروں کے احیاء وبقا کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی، ان اقدار کی بازیافت ہو۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

* نوٹ: اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کو اس بات کی کوئی اطلاع نہ تھی کہ پروفیسر سید سراج الدین مرحوم نے جاوید نامہ کے ترجمہ کی ایک نقل ڈاکٹر نذیر احمد شیخ صاحب کو روانہ کی ہے۔ پروفیسر سراج کے افراد خاندان کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔ ان کے قریبی مخلص احباب فرزند اور صاحبزادی کی خواہش تھی کہ جاوید نامہ کا ترجمہ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہو۔ چنانچہ یہ ترجمہ اب شایع ہو چکا ہے۔ (ادارہ)

○○○○

# اقبال اکیڈیمی کا خبر نامہ

## اجتماعات

### زیر اہتمام: اقبال اکیڈیمی و اسلامک ہرٹیج فاونڈیشن

تاریخ: ۱۸ نومبر ۲۰۰۶ء

توسیعی تقریر: **جناب محمد ریاض الحسن**

صدارت: **پروفیسر یوسف کمال**

دنیا میں کوئی بھی مذہب اتنی تیزی سے نہیں پھیلا جتنی سرعت کے ساتھ اسلام ساری دنیا میں پھیل گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا وہ اسلام کی کردار سازی اور حق گوئی کی اقدار کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اقبال نے اسلام کے سنہرے دور کا نقشہ اپنی کئی نظموں میں بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ جس کا ایک نمونہ ہمیں انکی شاہکار نظم مسجد قرطبہ کے آخری بند میں ملتا ہے۔ حال ہی میں ایران کے اعلیٰ مذہبی رہنما علی خامنہ ای نے کہا ہے کہ اقبال کا کلام درسگاہوں میں لازمی طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار جناب محمد ریاض الحسن نے اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقدہ اپنے توسیعی لکچر میں کیا۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا 'اگر آج علامہ اقبال ہوتے'۔ جناب ریاض الحسن سیول انجنیئر ہیں۔ انہوں نے ماہر آبی وسائل کی حیثیت سے کم وبیش تیس ممالک میں خدمات انجام دی ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے انجنیئر ہونے کے باوجود ریاض الحسن صاحب کلام اقبال سے شغف رکھتے ہیں۔

ابتدا میں معتمد اقبال اکیڈیمی جناب سید امتیاز الدین نے ریاض الحسن صاحب کا خیر مقدم کیا اور حاضرین سے انکا تعارف کرایا۔ اس موقع پر جناب کریم رضا سابق معتمد اقبال اکیڈیمی کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج وملال کا اظہار کیا گیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

محمد ریاض الحسن صاحب نے دنیا کے موجودہ حالات کا جائزہ لیا اور مسلم ممالک کی کثیر تعداد کے باوجود ان کی پست ہمتی اور بے حسی کا ذکر کیا۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات ہم سب کیلئے عبرتناک ہیں۔ آج تک اس سازش کا کوئی ثبوت نہیں ملا لیکن مسلمانوں کو ہی مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ مسلم دنیا کے سارے ۵۷ ممالک ہیجانی کیفیت سے دوچار ہیں۔ اگر آج اقبال زندہ

ہوتے تو یقیناً اُن کو اِس صورت حال سے صدمہ پہنچتا۔ ریاض الحسن صاحب نے بڑی محنت اورعرق ریزی سے کلام اقبال سے منتخب اشعار کو پیش کیا جس سے ان کے مضمون میں جامعیت پیدا ہوگئی تھی۔

صدر جلسہ پروفیسر یوسف کمال نے کہا کہ اقبال کی شاعری اور فکر سے ان کی شخصیت مکمل ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ اقبال مغرب کے مخالف تھے شاید صحیح نہیں ہے۔ اقبال مغرب کی ترقی سے متاثر تھے۔ اقبال نے ترکی اور مصر سے بہت توقعات رکھی تھیں لیکن وہ اپنی زندگی ہی میں ان دونوں ملکوں سے مایوس ہوگئے تھے۔ پروفیسر یوسف کمال نے آل احمد سرور کے مقالے 'اقبال کی معنویت' کا حوالہ دیا۔ اقبال ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کے آرزومند تھے جس سے نئی مشرقیت کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جائے۔

جناب عبدالمقیت صاحب' جناب شاہد حسین صاحب اور ڈاکٹر عسکری نے سوالات کئے جن کا فاضل مقرر نے جواب دیا۔ جلسے میں باذوق سامعین کی کثیر تعداد شریک تھی۔ معتمد اقبال اکیڈیمی سید امتیاز الدین صاحب کے شکریے پر جلسہ اختتام کو پہنچا۔

سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی

☆☆☆☆☆

تاریخ: ۱۷/ڈسمبر ۲۰۰۶ء

توسیعی تقریر: **ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب**

موضوع: اقبال کی شاعری میں 'عقل ودل کے استعارے'

صدارت: **جناب محمد ظہیر الدین**

دنیا کے عظیم شعرا میں اقبال کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے کلام کے جتنے ترجمے مختلف عالمی زبانوں میں ہوئے ہیں کسی اور شاعر کے کلام کے نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود بھی اقبال کی فکر کو آج تک صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ مشرق میں اقبال کی شاعری کو الگ رنگ میں دیکھا گیا ہے اور مغرب میں الگ انداز سے ان کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے اقبال کی شاعری میں عقل ودل کے استعارے کے زیرعنوان توسیعی تقریر میں کیا جس کا اہتمام اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے گلشن خلیل ماں صاحب ٹینک کی زیریں منزل میں کیا تھا۔ اس ادبی نشست کی صدارت محمد ظہیر الدین صاحب صدر اکیڈیمی نے کی۔ جلسہ کا آغاز قاری

مشیر الدین علی کے قراءت کلام پاک سے ہوا۔ سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی نے کلام اقبال پیش کیا۔

مہمان مقرر کا خیر مقدم کرتے ہوئے ظہیر صاحب نے کہا کہ عقل و دل اقبال کے پسندیدہ استعارے ہیں۔ اقبال کی فارسی اور اردو شاعری میں صرف دل پر تقریباً ایک ہزار اشعار ملتے ہیں۔ اقبال کے تعلق سے ایک غلط فہمی یہ ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں اور عشق کے قائل ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اقبال نے عقل کو دانش برہانی کہا ہے اور یہ تصور پیش کیا کہ عقل کی تکمیل وحی اور روحانی تجربہ سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ شکیب صاحب کی تقریر سے اس موضوع کے کئی گوشے سامنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کہا کہ عشق اور عقل کے موضوع پر دکھنی شاعری میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ سراج اور ولی کے پاس ہمیں اس رنگ کے بہت اشعار ملتے ہیں۔ یہی رنگ تغزل جب شمالی ہند پہنچا تو میر و غالب کی طبع آزمائیوں نے اس موضوع کو اور زیادہ وسعت دی۔ اقبال نے جب شعر گوئی کا آغاز کیا تو ان کو ہماری شاعری کی یہی روایات اور رجحانات ورثے میں ملے۔ غالب ہماری زبان کا وہ شاعر ہے جس کا اسلوب محض روایتی نہیں بلکہ وہ جدیدیت کا علمبردار ہے۔ اقبال نے غالب کے رنگ سخن اور اسلوب سے زیادہ استفادہ کیا۔ غالب قلب آگاہ کے مقابلہ میں طبع آگاہ کے قائل تھے۔ اقبال کے عہد سے پہلے اس ملک میں سیاستداں یا قومی لیڈر نہیں تھے بلکہ قیادت کا کام بھی علماء انجام دیتے تھے۔ اگرچہ اقبال کی تعلیم مکتب میں نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے اساتذہ مکتب کے تربیت یافتہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال کا رجحان روحانیات کی طرف زیادہ تھا۔ جب وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ گئے تو ان کو نئے ماحول کا سامنا ہوا۔ انہون نے برملا کہا کہ میں یورپ کے داناؤں میں بیٹھا لیکن مجھے ان میں سوز اور جراءت رندانہ کی کمی محسوس ہوئی۔ اقبال کی نظمیں روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے اور عقل اور دل اقبال کے طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیب نے کہا کہ دل اور محبت میں گہرا ربط ہے۔ اقبال نے ہر تحریک کا مطالعہ کیا لیکن کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے۔ البتہ تاریخ کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا اور تاریخی واقعات کی اپنے طور پر تاویلیں کیں۔ کبھی مشرق و مغرب دونوں سے اقبال بیزار ہو جاتے تھے اور کبھی اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر۔ کیوں کہ مغرب عارفانہ نظر سے محروم ہے۔ اقبال حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے بہت متاثر ہیں۔ اسی لئے وہ

عشق تمام مصطفیٰ ﷺ عقل تمام بولہب جیسی فکر انگیز بات کہتے ہیں۔ خرد کو وہ چراغ رہ گذر کہتے ہیں جس سے راہرو روشن بصر ہے لیکن اسے درون خانہ ہنگاموں کی کوئی خبر نہیں۔

صدر جلسہ محمد ظہیر الدین نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب کی تقریر میں لطیف اشاروں سے عقل اور دل کے استعاروں کے مختلف رنگ ظاہر ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اقبال نے لکھا ہے عقیدہ کو عقلی اساس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے ظہیر صاحب نے کہا کہ فواد اور قلب کے معانی میں نازک فرق ہے۔ اقبال عقل خود بین کے خلاف ہیں۔ عقل کو دل کے نور سے منور ہونا چاہئے۔ اقبال نے جاوید نامے میں کہا ہے کہ عقل کی موت ترک فکر ہے اور دل کی موت ترک ذکر ہے۔

جلسہ گاہ میں باذوق سامعین کی کثیر تعداد تھی۔ پروفیسر جاوید انصاری' جناب محمد ریاض الحسن' جناب محمد عبدالمقیت' ڈاکٹر شمشاد حسین اور جناب قدیر زماں وغیرہ نے سوالات کئے جن کا فاضل مقرر نے جواب دیا۔ جناب سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی کے شکریہ پر یہ پر لطف محفل اختتام کو پہنچی۔

☆☆☆☆☆

تاریخ: ۱۰ر فبروری ۲۰۰۷ء

مقرر: **جناب محمد ظہیر الدین**

موضوع: شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

صدارت: پروفیسر محسن عثمانی' صدر شعبہ عربی (سیفل)

اقبال نے اپنی حکیمانہ شاعری میں حضرت موسیٰ کی زندگی سے متعلق مختلف تلمیحات اور اشارات کو موضوع بناتے ہوئے اپنے دور کے تقاضوں کی روشنی میں نئی معنویت عطا کی ہے۔ مثلاً ید بیضا' عصائے کلیمی' ضرب کلیمی' سحر سامری' طور و سینا وغیرہ۔ اسی طرح اقبال نے شبانی کے استعارہ کو نئی جہت عطا کی ہے۔ اور کہا ہے کہ ؎

یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

ان خیالات کا اظہار جناب محمد ظہیر الدین صدر اقبال اکیڈیمی نے اپنی توسیعی تقریر میں کیا۔ جس کا اہتمام اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام کیا گیا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت پروفیسر محسن

عثمانی صدر شعبۂ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجس نے فرمائی۔ ابتداء میں ڈاکٹر مظفر عالم استاذ عربی سیفل نے تلاوت کلام پاک سے جلسے کا آغاز کیا۔ جناب سید امتیاز الدین معتمد اکیڈیمی نے کلام اقبال پیش کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

جناب محمد ظہیر الدین نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ شبانی سے مراد حضرت موسیٰ کا وہ دس سالہ دور ہے جو انہوں نے گلہ بانی یا بکریاں چراتے ہوئے حضرت شعیبؑ کے زیر تربیت گزارا تھا۔ جس کے بعد آپ کو کار نبوت سے سرفراز کیا گیا تا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات دلا سکیں۔ اقبال کے نزدیک شبانی انسانی شخصیت' حالات کے سرد وگرم کو برداشت کرتے ہوئے 'استعداد اور صلاحیت پیدا کرتی ہے اور اس کے امکانات ظاہر ہوتے ہیں۔ شبانی کے ساتھ دشت وصحرا' کوہ وبیاباں کی زندگی وابستہ ہے جو تہذیب وتمدن کی آسائشوں کے تکلفات سے پاک ہوتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں عروج کا یہ پہلا مرحلہ ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں' قوموں کی زندگی میں صحرائیت اور بدویت کے مرحلہ' پر زور دیا ہے۔ ظہیر صاحب نے کہا کہ ہر دور میں فرعون اور کلیم کی کشمکش نئے انداز سے جاری رہی ہے۔ جس کے مقابلے کے لئے حق کے علمبرداروں اور قافلہ سالاروں کو قیادت سے پہلے تربیت کے ذریعہ اپنے اندر للّٰہیت کے ساتھ ساتھ ناسازگار حالات سے معرکہ آرائی کی صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے۔

پروفیسر محسن عثمانی نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ نثری ترسیل اور شعری ترسیل میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی بات جب شعری استعارے میں آئے گی تو نہ صرف طرز بیان مختلف ہوتا ہے بلکہ اس میں بے پناہ اثر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال اقبال کی شاعری میں تلمیحات اور استعارات کا ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی نے فرمایا کسی شعبہ کا طالب علم اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک کسی صاحب نظر کا فیض صحبت حاصل نہ ہو۔

دربار شہنشہی سے بہتر مردان خدا کا آستانہ ہے۔ اس سے وہ کلیم صفت انسان تربیت پاتے ہیں جو اپنے دور کی فرعونی قوتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ آج اقبال کی زبان میں کہا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ہمارے کوہ وکمر کلیموں سے خالی ہیں اور دنیا پھر ضرب کلیمی کی منتظر ہے۔

آخر میں جناب محمد ضیاء الدین نیّر نائب صدر اکیڈیمی کے شکریہ پر یہ محفل اختتام کو پہنچی۔

☆☆☆☆☆

تاریخ: ۱۷ر فبر وری ۲۰۰۷ء

توسیعی تقریر: جناب محمد عارف الدین سینیر سائینٹسٹ (سی سی ایم بی)

موضوع: ہر ذرّہ شہید کبریائی

صدارت: **ڈاکٹر سید عبدالمنان**

معلوم کائنات کی بے پناہ وسعتیں، پھیلی ہوئی کہکشائیں جن کا احاطہ ہنوز انسانی عقل نہیں کرسکتی۔ اور اربوں کہکشاؤں کے اندر کھربوں ستاروں کا موجود طلسم نہیں ہے بلکہ خالق کائنات کی خلقت اور ربوبیت کا اظہار ہیں۔ اسی طرح ایک میٹر کے کروڑویں حصّہ سے بھی کم ایک ناقابل تصور چھوٹے سے ذرّہ میں ایک کائنات پوشیدہ ہے۔ اس ذرّے کا اپنا ایک نظام ہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب محمد عارف الدین سینیر سائینٹسٹ (سی سی ایم بی) نے اپنی توسیعی تقریر میں کیا۔ ہر ذرّہ شہید کبریائی کے موضوع پر اس لکچر کا اہتمام اسلامک ہریٹج فاؤنڈیشن کی جانب سے لکچر ہال اقبال اکیڈیمی گلشن خلیل پر کیا گیا تھا۔ محترم ڈاکٹر سید عبد المنان نے صدارت فرمائی۔ قاری مبشر علی نے ابتداء میں آیات قرآنی کی تلاوت کی۔ جناب سید امتیاز الدین نے کلام اقبال پیش کیا۔ جناب قاسم رضا شریک معتمد نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ جناب محمد عارف الدین نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ایک ایٹم کا ہم اسکی جسامت کو لاکھوں گنا بڑھا کر مشاہدہ کریں تو ہمیں پروٹون، نیوٹرون اور الکٹرون کا پتا چلتا ہے۔ پھر وسیع تر پیمانے پر مزید ذیلی ذرّات ملیں گے جن کی حیثیت برق پاروں کی ہوتی ہے۔ ایٹم کے ان ذرّات کی ایک ترتیب ہوتی ہے جو مقررہ مداروں پر حرکت کرتے ہیں۔ اس طرح ایک ذرّہ میں ایک کائنات پوشیدہ ہوتی ہے جو خالق کائنات کی قدرت اور حکمت کی گواہی دیتی ہے۔ مرد کا نطفہ ایک انچ کا دس ہزارواں حصہ ہوتا ہے۔ اس میں پائے جانے والے مادّے DNA میں جتنے پیامات پوشیدہ ہوتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کو ایک ہزار صفحات کی کتاب میں لکھا جائے جس کے ہر صفحہ پر ایک ہزار حرف ہو تو ایسی ۵۸۰۰ جلدوں کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح ایک پتہ میں آکسیجن کو خارج کرنے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کرنے کے لاکھوں کارخانے ہیں۔ جن پر جانداروں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ جناب محمد عارف الدین نے کہا کہ غرض عالم جمادات، نباتات وحیوانات کے ہر ذرّہ میں نمو اور حیات کارفرما ہے۔ جو معرفت الٰہی کا وسیلہ ہے۔ اس بات کو اقبال کی شعری زبان میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ 'ہر ذرّہ شہید کبریائی'۔ اس تقریر

کے بعد سوالات کئے گئے جن کا جواب فاضل مقرر نے دیا۔ صدر اجلاس محترم ڈاکٹر سید عبدالمنان نے بحیثیت ایک ماہر علوم طب نے اپنے صدارتی ارشادات میں انسان کی پیدائش کے مختلف مراحل کا تذکرہ فرمایا۔ موصوف نے فرمایا مرد کے ایک نطفہ اور عورت کے ایک بیضہ کے ملاپ سے پیدائش کا آغاز ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبدالمنان نے جنین سے لیکر ایک آخری مرحلے کی صورت گری تک مختلف مراحل کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حالیہ تحقیقات' قرآن مجید کی تصریحات کی تصدیق کرتی ہیں۔ طبعی اعتبار سے یہ خالق کائنات کی حکمت ہے کہ مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے انسان بڑھاپے کو پہنچتا ہے۔ حواس کمزور ہوتے ہیں۔ یادداشت باقی نہیں رہتی۔ اور انسان کی حالت ایک بچے کی طرح ہو جاتی ہے۔ ان ساری باتوں میں ہمارے لئے عبرت اور بصیرت کا سبق ہے کہ ہم خالق کائنات کی حکمت کو سمجھ سکیں۔ جناب قاسم رضا شریک معتمد فاؤنڈیشن کے شکریہ پر اس فکر انگیز محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

## اکیڈیمی اور فاؤنڈیشن کا غیر رسمی اجلاس سال رواں کا پروگرام

بتاریخ ۲۲ رجنوری ۲۰۰۷ء اکیڈیمی اور اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن کے اراکین کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں سال رواں کے لئے حسب ذیل پروگرام طئے کیا گیا۔

۱۔ سرگرمیوں میں توسیع کے لئے منصوبہ بندی

ا۔ رکنیت سازی وتعارف

ب۔ پابندی سے ماہانہ اجتماعات کا انعقاد (اکیڈیمی اور فاؤنڈیشن کے تحت ایک ایک اجلاس)

ج۔ سال رواں میں کم از کم دو تعلیمی اداروں سے ربط۔

اور زیر تعلیم طلباء/طالبات کے لئے تعارف اقبال پر مقابلے۔

تقریری مقابلہ / کوئز / کلام اقبال ترنم سے پڑھنے کا مقابلہ وغیرہ۔

اقبالیات سے متعلق تصاویر کا ڈسپلے بشرطیکہ انتظامیہ درکار سہولتیں فراہم کرے۔

۲۔ ریویو۔

ا۔ ملک اور بیرون ممالک قلمی اعانتوں کے لئے ربط۔

ب۔ ریویو کے خریداروں میں اضافہ کی کوشش۔

ج۔ جناب محمد عبدالمقیت صاحب نے بہ حیثیت شریک معتمد اکیڈیمی کی ذمہ داری قبول کی۔

۳۔ کتب خانہ۔ کتابوں / رسائل کا تحفظ، تنظیم اور ترتیب۔

ایک کمیٹی ان امور کی نگرانی کرے۔

جناب محمد عمر علی خان صاحب، جناب عبدالمقیت صاحب، جناب ایم۔اے۔صدیقی صاحب، جناب محمد ظہیر الدین۔

۴۔ سیرت طیبہ، اسلامی خطاطی، فن تعمیر، اسلام اور سائنس وغیرہ سے متعلق موجود طغروں، چارٹس اور تصاویر کا تحفظ اور نمائش۔ جناب ایم۔اے۔صدیقی صاحب نے بہ حیثیتِ شریک معتمد فاؤنڈیشن اس کام کی ذمہ داری قبول کی۔

۵۔ ماہ اگست ۲۰۰۷ء میں یا کسی اور مناسب تاریخ پر جنگ آزادی کی ۱۵۰ سال کی تکمیل کے موقع پر نمائش / سمینار وغیرہ۔

۶۔ ستمبر ۲۰۰۷ء یا کسی اور مناسب تاریخ پر مولانا جلال الدین رومی کے ۸۰۰ سالہ یوم پیدائش کی دو روزہ تقاریب۔

۷۔ اکیڈیمی کے تحت طلباء کے لئے دو آسان کتابوں کی اشاعت۔ انگریزی اور علاقائی زبانوں میں۔

۸۔ فاؤنڈیشن کے تحت مسلم سائنس دانوں کی تصاویر کے ساتھ ان کے کارناموں پر مشتمل کتاب کی اشاعت (انگریزی)

کتب خانہ:۔

پچھلے پانچ ماہ کے عرصہ میں کتب خانہ اقبال اکیڈیمی کے حسب ذیل اداروں اور اصحاب نے کتابوں کا عطیہ دیا ہے۔ اکیڈیمی ان مخلص معاونین کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

(۱) اقبال اکیڈیمی پاکستان سے جملہ ۱۴ کتابیں وصول ہوئیں۔

(۲) پروفیسر بشیر احمد نحوی ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی نے ۹ کتابیں روانہ فرمائیں۔

(۳) اہلیہ و ڈاکٹر محمد ریاض الدین (امریکہ) Splendours of Quran-Calligraphy & Illumination by Martin Lings

(۴) جناب نصیر الدین ولد جناب وجیہ الدین احمد (شارجہ) Mecca-Madina: Holiest Cites-Photographs by Ali Kuzuyoshi

(۵) جناب محمد عبدالقادر (امریکہ)

(۶) ڈاکٹر سلیم میر (امریکہ) نے دو کتابیں عنایت فرمائیں۔

(۷) جناب سید احمد ایثار (بنگلور)۔

(۸) اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن کے سکشن کے لئے جناب محمد عمر علی خان صاحب کارگزار صدر نے ۳۶ کتابیں عنایت فرمائیں جس میں مولانا رومی' اسلام اور سائنس' پر اہم کتابیں شامل ہیں۔

۹۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے اناماری شمل کی تصنیف 'کیلی گرافی اینڈ اسلامک کلچر' عنایت فرمائی۔ اس کمیاب کتاب کا زیراکس انہوں نے لندن سے منگوایا۔ اس سے قبل انہوں نے اسلامی آرٹ اور کلچر پر کئی کتابیں کتب خانہ کو مرحمت فرمائیں۔ جس کے لئے اکیڈیمی موصوف کی ممنون ہے۔

۱۰۔ ڈاکٹر اخلاق اثر (بھوپال)۔ اقبال نامے اور دیگر کتب۔

.....

# اقبال اکیڈیمی میں معزز مہمانوں کی آمد

حال ہی میں حسب ذیل معزز اسکالرس و ہمدردوں نے اقبال کیڈیمی اور کتب خانہ کا معائنہ فرمایا۔

۱۔ ڈاکٹر سلیم میر (نیویارک)' ۲۸ر ڈسمبر ۲۰۰۶ء

۲۔ ڈاکٹر محمد ریاض الدین (امریکہ)

۳۔ ڈاکٹر جعفر حسین قریشی (لندن)' ۳۱ر ڈسمبر ۲۰۰۶ء

۴۔ ڈاکٹر سید عبدالسمیع (امریکہ)' ۶ر جنوری ۲۰۰۷ء

۵۔ ڈاکٹر مظفر حسین (امریکہ)' ۲۳ر جنوری ۲۰۰۷ء

۶۔ جناب رشید انجینئر' جناب مظہر علی خان' جناب محمد انیس الدین' جناب بشیر احمد' جناب شفیق الرحمٰن شفا' ڈاکٹر وسیم احمد

(اقبال اکیڈیمی پر بھنی کا وفد ۲۹ر جنوری ۲۰۰۷ء)

۷۔ پروفیسر شمیم حنفی (دہلی)

☆☆☆☆☆

# Iqbal Review

## April 2007

# English Section

## Contents


1. Foreword
   (on the book "The Cool Breeze from Hind"
   By Mujeeb Rahman Jaihoon)
   *Md. Zaheeruddin* 2

2. Allama Iqbal and Umar Qazi
   (Two lovers of the Holy Prophet SAWS)
   A Comparison
   *Mujeeb Rahman Jaihoon* 5

3. Our Master Jalaluddin Rumi
   *Kabir Helminski* 22

4. Mawlana Jalaluddin Rumi
   Life and Works --- 33

What do you really possess,
And what have you gained in this life?
What pearls have you brought up
From the depth of the sea?
On the day of death,
Your physical senses will vanish.
Do you have the spiritual light
To illumine your heart?
When dust fills your eyes in the grave,
Will your grave shine brightly?

Rumi
Masnavi II:939-41

Md. Zaheeruddin

## FOREWORD

*On the book "The Cool Breeze from Hind" 2nd Edition*
*By Mr. Mujeeb Rahman 'Jaihoon' (Sharjah)*

My first impression about the book was that it was the product of a burning heart endowed with mystic vision and wisdom. I was only taken aback when asked to write a Foreword for such a work of literature, as I believe it is beyond my capacity to do so. Perhaps the only motivation was my association with Iqbal Academy Hyderabad and its activities with the object of disseminating the dynamic and universal message of Iqbal.

The warmth of the author's sincere words melted me and I could not say 'No' to his request. As a result, here are my "Stray Reflections" on the book at hand.

Firstly, the title of the book, 'The Cool Breeze From Hind' has fascinated me as it refers to a saying of the Holy Prophet (Peace be upon him). It is a symbolic expression with delicate shade of meaning. This symbolism is given a spiritual twist by attributing to it a mystical dimension. Nevertheless, its historical value remains unquestioned.

The second striking point is 'Jaihoon[1]'- the pen name of the author, derived from a couplet of Iqbal. Allow me to quote its translation:

> *"In the heat of the fire of Rum is your remedy,*
> *On your intellect the Frangs have cast their spell;*
> *My eye is illumined by his grace,*
> *By his munificence Jaihoon is contained in my ewer"*

---

[1] Referring to a river in Turkistan.

In his masterpiece, 'Javid Namah', Iqbal identifies himself with "Zinda Rud", meaning a'vibrant river full of life. Javid Namah is a journey to the heavens. But 'The Cool Breeze' is a spiritual travelogue across the author's homeland. Yet, many similarities may be traced in the style and technique of the presentation.

The metaphor of 'river' is very dear to Iqbal. A single reference will elucidate this point.

> *"O Spring rain! The shell and the pearl are worthless*
> *If they do not throw the heart of the river into ferment"*

The reader will surely agree with me that the vibrant waves of Jaihoon have thrown many precious pearls on the shore.

In this travelogue, the historical consciousness of the author is reflected sincerely. We come across with many personalities and places in very relevant perspective. Though the author feels proud as a son of Hind, he has a deep-rooted passion for his homeland. Yet, he does not remain a captive of the narrow barriers of ethnicity. It is not earth-rootedness, rather serves as a point in space to diffuse a universal message, which is neither bound by time nor space. The author is equipped with a creative future-oriented insight.

The tale of Nightingale (Jaihoon) and Tasbih (Rose) advances covering a variety of topics. The approach is philosophical, rather mystical. The author aggressively takes on the prevailing conventions, both modern and

traditional, and is ruthless in this criticism of his own community's lethargy and hypocrisy. He draws startling conclusions while analyzing the past and observing the present, which is sure to raise eyebrows among the conservative circles. In between there are 'pauses' enriched with beautiful and powerful imagery which refreshes the reader's mind. The fascinating style of the beautiful language of the heart captivates one's imagination and transforms the reader to become a co-traveler along with the author.

In the Epilogue, we come across with the creative passion of *'Firaq'* (Separation) which inflicts pain, grief, restlessness and longing for the 'Beloved'. It is a very forceful impulse which invigorates the 'lover' to continue his journey kindled with the flame of love.

Ultimately the mystery of the 'Cool Breeze' unfolds. The wailing and heart-rending *dua'* is responded. Jaihoon realizes that, "The Beloved is hidden in you heart"

'The Cool Breeze' symbolizes the intensity of love which transcends from the solitude of the 'Cave of Heart' and echoes from the 'Mount of Faran' and reaches to 'Arafat' reverberating with an eternal message of love and mercy for all the domains of existence.

Jaihoon has a long way to go. He has to grapple with the vibrant waves and bring forth precious pearls. May Allah keep the flame of 'Love' burning in his heart! I salute his bright future.

Mujeeb Rahman 'Jaihoon'
Sharjah

# Allama Iqbal and Umar Qazi: Two lovers of the Holy Prophet صلّ الله عليه وسلم A Comparison

(The author is Chief Editor of Jaihoon.com, a non-profitable initiative delivering innovative and thought-provoking perspectives. He writes frequently on mystic themes and contemporary issues. He lives in the Middle East with his parents, wife and son and has authored three books, Egoptics (2002, Calicut) and Henna for the Heart (2003, New York) and The Cool Breeze From Hind (2006, New Delhi).

## Introduction

The state of lovers is strange. Trees and rivers do not entice them in the absence of the Beloved. They feel lonely in the crowd. The Rose feels solitary in the colorful *Gulistan* without the Nightingale's presence. How can the bee remain separated from its hive? All the hue and scent are measured in comparison to the Beloved. "Life spent away from the Master is veritable death", said Allama Iqbal, the passionate lover of the Holy Prophet صلى الله عليه وسلم.

Yet in their Legacy of Love, it is the same fragrance every lover inhales. The language of all love is one. The end of all love is one. They experience the same thirst. It is not possible for everyone to understand the mystery of this thirst. And how can they when the thirst is lost in the heart of the Lover?

## Purpose of this essay

The purport of this essay is to explore the similarities of thought between Allama Iqbal and Umar Qazi, both of whom were inspired by their love for the Holy Prophet صلى الله عليه وسلم. From known records, there is no evidence of Sialkoti's acquaintance with Vilankoti[1]. Destiny had separated these two gargantuan poets of Islam by almost a century and half. One lived in the North; the other in the South of the British ruled India. Many were the differences between them but nevertheless the similarities were greater.

## Umar Qazi

### Background

In 19th and 20th centuries, India had to bear many sufferings at the hands of British rule. The Indian Muslims fought with full vigor to oppose the British imperialistic designs. They had to face drastic economic consequences as a result. In the anti-imperialistic battle, great leaders who left their marks on history led them. Umar Qazi of Veliyankode, a small town in Ponnani[2] - the Sufi poet on horseback – was such a leader whose patriotism made him the trademark of anti-British sentiment during his lifetime.

---

[1] Allama Iqbal was born in 1873 at Sialkot while Umar Qazi was born in 1765 at Veliyankode

[2] Ponnani in those days was known as the Minor Makkah. A well-known center of Islamic learning in present Kerala's Malappuram district, scholars from all over the world would flock to this land. It produced some of the best Muslim minds, including the world renowned Sheikh Zainudhin Makhdum (considered as the Thucidydes of Kerala).

## Life sketch

Born in 1765 AD in a very pious family, Umar Qazi was to become the pride of Muslim Kerala as the visionary poet and a just reformer. He showed unusual signs of greatness in childhood. His father, Ali Musliyar, used to take Umar to the great saints when they would pass by Veliyankode.

At the age of 7, his mother passed away. Umar Qazi grew in the company of his father. He learnt Quran recitation, aqeedah (theology)and fiqh (Jurisprudence) from his father. At 10, his father too passed away. At 11, he joined the Madrasa at Tanoor. At this stage, he used to inscribe poems on walls of mosques and houses. He also paid visits to his parents' graves and prayed for them. At 13, he joined Ponnani Madrasa for higher studies.

After completing his studies in Ponnani Madrasa, he was made the Qazi (judge) of Veliyankode. Other neighboring areas also proclaimed Umar as the Qazi.

Once Umar Qazi went to Mampuram to hold discussion on Islamic law with Syed Alavi[3]. At one point of time, he doubted the spirituality of Syed Alavi. It is said that as a

---

[3] He landed at Calicut on 1181 A.H and went to Mampuram accompanied by his uncle Syed Sheikh Jifri from Hadra Maut in Yemen. Within a short span of time, Syed Alavi arose to be the undisputed spiritual leader of Malabar. A champion of the Qadiriyya branch of Sufism, he was also a scholar of great repute and also a strong opponent of British invaders. The British were especially fearful of the Arab Syeds of Tirurangadi.

result, he forgot what he had learnt. Thereafter, Umar Qazi realized that Syed Alavi was the Qutb-uz-Zaman ('the Axis of the Era' in Sufi terminology) and he was a divine scholar. He apologized for misunderstanding the great saint. Syed Alavi bestowed the mantle of the Qadiriyya tariqa on Umar Qazi and taught him the secrets of the spiritual domain. Later on Umar used to visit Syed Alavi often and became a close disciple of the saint.

## Confrontation against the British Rule

Umar was a tacit critic of the British Empire and their imperialistic designs. He considered it a religious duty to oppose such powers and side with the oppressed. In this aspect he was larger than a poet who would normally remain secluded from the political and social developments affecting the community. He saber-rattled with the mightiest empire of those days, feared neither the British nor the native civil servants who served them. However, he never resorted to an armed struggle in which innocents would be killed. As a true Muslim, he did no believe in shedding blood for a purely regime change (an important lesson for many present-day uprisings in Muslim countries)

## Non-Taxation

He realized that the secret of the Colonial Behemoth was its colossal tax revenues collected from around the world. This realization led Umar to fire his most powerful salvo against the British when, in 1805, he publicly announced his defiance of the British taxation system. When the officers approached the brave hero requesting him to pay

his taxes, he gave a fiery reply "You are servants of the murderers of Tipu Sultan and destroyers of Samudiri, Arakkal, Kochi and Kodungallur[4]. Almighty is the true owner of the land. I will not pay the tax". It is to be noted here that Umar Qazi introduced the Non-Taxation Movement decades before Mahatma Gandhi started it towards the last stages of the Indian freedom struggle. He was later tried and jailed but released fearing popular uprising from the community.

### Umar the Poet

Notwithstanding his political genius, Umar was a loquacious poet as well. He could compose melodious verses with equal aplomb befitting the context and appealing to the common man. His mastery of Arabic was impeccable and his poems became a daily metaphor for the people of Ponnani. His poems covered a variety of topics, but it should be stated that hardly any were particularly romantic. Majority of them were based on canons of Fiqh, especially of the Shafi' school Islamic law. Perhaps it is rare to find in the history of Islamic world a poet of his genre. His poetry included topics such as marriage and divorce, inheritance, advent of Islam in Kerala, social malpractices, innovations in religion, etc

He also peppered his poetry on walls of Masjids in and around Ponnani. He could effortlessly interweave regional Malayalam and *Arabi Malayalam*[5] words. Once he passed

---

[4] Different political powers who reined in Kerala, especially Malabar region.

[5] A superbly melodious language used by Muslim community in Malabar, with vocabulary inputs and grammar from languages

by the historic *Thottungal Masjid*, believed to have been built by Shaikh Faird[6], (a North Indian Sufi, who visited Ponnani) and recited thus:

يا مسجد الخيرات فضلك ظاهر
كم من يصلي فيك كان وذكر
"توتنجل بالي" سماك انت يمين من
صلي "بوناني" وانت الأخر

---

including Malayalam, Sanskrit and Tamil and written in Arabic, which contributed impassioned works of literature in its youthful period. Such was its style and rhythm, that its speakers would send letters and messages in poetized form. The contribution made by Arabi-Malayalam in inspiring the anti-colonial feeling was unparalleled. The majority of the writings banned by the British were in Arabi-Malayalam. The major products of Arabi Malayalam include Qazi Muhammad at Calicut, Syed Sanullah, Syed Shujai, Vakkam Abdul Qadr, Moinkutty Vaidyar and Kunhai Musliyar. Works like *Husnul Jamal* and *Badr Padappattu* and *Kappa Pattu* have been rendered into English. The language is as good as defunct today.

[6] Hazrat Baba Fariduddin Ganj-e-Shakar r.a. was born on the 29th Sha'ban in 569 A.H. [April 4, 1179 C.E.] in Khotwal, a village near Lahore [Pakistan]. He was a direct descendant of Hazrat Umar Farooq r.a., the second Caliph of Islam. Baba Farid Ganjshakar is revered by Muslims as well as the Sikhs as one of the Sikh Bhagats because the Sikh Gurus included several of his verses in the Guru Granth Sahib.Every year thousands of people gather around at his shrine at Pak Pattan to pay their respects and to take blessings. He was the spiritual master of Nizamuddin Awliya. He was also the spiritual disciple and khalifa (spiritual successor) of Qutbuddin Bakhtiar Kaki in the Chishtiyya Sufi order.

A lengthy description hitherto of the poet and social reformer of Malabar was given to provide a clear picture before the forthcoming topics of discussion. It would be an exaggeration discuss the details of the life of Allama Iqbal in this journal.

## Comparison

The similarities between the two personalities under discussion can be summarized under various topics evident from their literary works and life.

### 1. Communal Harmony

Umar Qazi shone equally in political and religious circles as well. He saw Hindus, Muslims and Christians as one people and the British as the common enemy. He had high esteem for the Hindu rulers and as such he was given great honor in the court of Samudiri. He was a refined exponent of communal harmony in Malabar. True to the spirit of his creed, he would never instigate any act from his side which resulted in communal unrest.

Allama Iqbal 's *Tarana-e-Hind* popularly used in India as a patriotic song praising the communal harmony. In his poem Naya Shivala (A New Temple), Iqbal finds divine glory in every dust of the nation's soil. He wishes to build a temple in his heart which would be the highest place of worship. He further says,

*"shakti bhi shanti bhi, bhakton ke geet mein hai*

*Bharat ke basiyon ki mukti preet mein hai"*
Peace and power stay in hymns of devoted persons
Salvation of Indians lies in their mutual love

## 2. Religious Reforms

Umar Qazi's was a Sufi saint but at the same time he never approved malpractices that had crept into Islamic way of life. At a place called Kondotty, a name-sake saint had instructed his students to prostrate in front of him. Umar Qazi, a man of visionary reforms, could not tolerate his practice. Nor could the rest of Malabar for that matter. Many great scholars like Mampuram Syed Alavi, Syed Ahmed Makhdum, Panakkad Syed Muhammad Hussein strongly protested against the un-Islamic prostration. They issued fatwas, wrote numerous books and composed poems to strike at this evil practice. Umar Qazi also wrote a poem against this malpractice:

حرام سجود الخلق للخلق يكفر
به بارتدادٍ فهو في الذنب يكفر

A creation should not prostrate before another creation.

Doing so, he will be out of religion and become a unbeliever.

Qazi was never prepared to accept any *Tariqa* that was opposed to the tenets of Sharia. He was himself an ocean of *ma'rifat*, or divine knowledge. But that did not stop him from becoming subservient to the rulings of Islamic law.

Allama Iqbal too was a staunch critic of the preachers of pantheistic ideas within the fold of Islam. He could not refrain from protesting against the lethargy that had crept into the fold of the community at the hands of misguided Sufis. He found no passion in sitting with those at *Madrassa* and Khanqah.

### 3. Criticism of Social injustice and worldly mullahs

In addition to his political activism, Umar Qazi was also a social reformer and critic who questioned the hollow practices of society. Caste system was prevalent during his days which he could not tolerate. At one occasion he said addressing the proud members of the society.

> 'O those who become arrogant on your lineage!
> Recall your ancestors!
> Who were Thiyyan, Nayar, Ashari, Mushari,
> Pannan, Kushawan, Chetty, Nayadia and Parayar?
> You were the converts from these classes'

Due to his acerbic stand against moral corruption, he had to face charges of suspicion from many within his own community. He wanted to distribute the wealth and close the gap between the wealthy and poor. In many poems, he openly mocked the greedy nature of mullahs and their lust for worldly pleasures.

Iqbal also was critical of the differences among the community. He interpreted *Tawhid* to be reflected in the unity of human existence and in universal human ideals. He says that the Muslim community is "the dew of one

smiling dawn". In *Jawab-e-Shikwa,* Iqbal reminds the Ummah that:

> *"Yun tou sayyid bhi ho, mirza bhi, afghan bhi hou*
> *Tum sabhi kuch ho, Bataa musalmaan bhi hou*

Like the Poet of Veliyankode, the Poet born at Sialkot also mocked the anti-social behavior of those who served formal religion. In *"Baal-i-Jibril"* ("The Wings of Jabriel") the poem entitled *"Mullah aur Bahisht"*, has the following lines:

"When Almighty God ordained the Mullah to paradise,
I was also present there, and could not hold my tongue.
Submissively I said "Forgive me,
The Mullah will feel ill at ease in the paradise,
The houri, the wine and the verdant fields will not attract him.
Hair -Splitting and quibbling are in the nature of the man.
And paradise is not the place to bicker, argue and quarrel."

Instead of guiding humanity into the fold of Islam, as taught by the Mercy to all Worlds صلى الله عليه وسلم, the Mullah is preoccupied with hair-splitting issues and brands every other Muslim as infidels.

> "Because of the Mullah, the true religion has sunk lower than irreligiousness,

> For the Mullah instead of guiding the Muslims is busy branding the people as 'Kafir'.

Again, he says about the Mullahs who misuse the religion to serve their own vested interests. In certain cases, the fitna[7] caused by such conspiracies are more destructive than the acts of war committed by the Non-believers.

> The religion of the Kafir consists of planning for Jihad;
> The religion of the Mullah is creating trouble in the name of God."

## 4. Humility and Non-finality

Both were prepared to admit non-finality for their works. Very rarely can we see such thinkers who are prepared to accept faults with their works. Most artists think that their work of art is absolute which blinds them from the higher truths in life. In Omar Qazi's renowned philosophical poem, *Nafais-ud-Durar*, which has several lines praising the Prophet صلى الله عليه وسلم, he admits humbly:

> لو بصر الإخلال او عيباً ظهر
> فيها و لاكن بعد اِمعانِ النظرل
>
> If you find in this work any shortcoming or error
> Resolve it after careful consideration

Allama Iqbal too never claimed any sort of perfection for his thoughts, neither in poetry nor philosophy. In fact one

---

[7] lit. trial

of the core aspects of his thoughts is the perpetual evolution of human thought with the progress of time. In the preface to his philosophical masterpiece, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Iqbal admits, "It must, however, be remembered that there is no such thing as finality in philosophical thinking. As knowledge advances and fresh avenues of thought are opened, other views, and probably sounder views than those set forth in these Lectures, are possible. Our duty is carefully to watch the progress of human thought, and to maintain an independent critical attitude towards it."

## 5. Political Participation

The Holy Quran states in a Sura named Al-Shura'a [8](Poets)

> "And the Poets - It is those straying in Evil, who follow them: Seest thou not that they wander distracted in every valley?- And that they say what they practice not? Except those who believe, work righteousness, engage much in the remembrance of Allah, and defend themselves only after they are unjustly attacked. And soon will the unjust assailants know what vicissitudes their affairs will take".

Both Umar Qazi and Allama Iqbal belonged to the second category mentioned in the above-said verses. They were not among those distracted poets who talked of things they practiced not. Both participated in the political developments of their times. Qazi propounded the concept

---

[8] The very fact that a chapter is named after poets clearly indicate the importance of arts in Islam

of Non-Taxation for the oppressive British regime, while Iqbal wrote poems expressing patriotism and the suffering of the colonized nation. The two poets' thoughts were organically linked with the realities around them. Although both poets' poetry was kindled and inspired by their proverbial love for the Holy Prophet صلّ الله عليه وسلم (as we shall see later), both delivered their message in the context of the people around them.

## 6. Symbolisms

Both poets used a variety of birds and animals to elucidate their thoughts. While Umar Qazi mentions crow and fly to depict the feeling of greed and self-indulgence, Iqbal uses peacock and nightingale to represent the world of color and sound of this fleeting world. Besides, a peripheral reading of *Payam-e-Mashriq* will shows us that Iqbal takes the example from Falcon, quail, moth, hawk, eagle, fish and glow-worm to explain his philosophy.

## 7. Journey to the Prophet صلّ الله عليه وسلم

Umar Qazi left the land of Paddy Fields to visit the Beloved Hero of Hijaz صلّ الله عليه وسلم. At his homeland, he was engaged in fighting the colonial powers. He could not tolerate the Oppressive Regime reigning in his homeland. With pen and sword, he defied their every word. But to fight for his Hindi homeland, his strength lay in the Hijazi land. He left his homeland to quench the thirst of his heart. In the Hijri year 1209, he went on Hajj pilgrimage, boarding a ship from Calicut to Bombay and then to Jeddah. En route, he was made the *Amir*, chief, of the group of pilgrims for guiding them on matters of Hajj.

After performing the obligatory acts of Hajj at Makkah, he left for Madina to visit the grave of the Holy Prophet صلّ الله عليه وسلم. Sitting beside the *Rawdha Shareef*, he composed the long sentimental poem, *Salla-al-Ilah*, which is completely addressed to the Holy Prophet صلّ الله عليه وسلم. People around gathered around him listening to his melodious anguish-filled recitation and is reported to have witnessed certain miracles.

While Iqbal's pilgrimage was spiritual in nature, it was nevertheless with equal passion and vigor. Even while at home, his friends have related incidents when he would break into tears unable to control himself when anyone would make a mention of the Holy Prophet! صلّ الله عليه وسلم

Reading them both alongside each other, one can find striking similarities in the pattern of emotions and expressions which would make us suspicious whether they were contemporaries!

Leaving their homeland for the sake of the Prophet صلّ الله عليه وسلم

Qazi
*O the Full Moon perfect in shining*
*To my homeland I bid farewell in your longing.*

Iqbal
*Despite old age I took the way to Yathrib*
*Singing with the ecstasy of Love*
*Like the bird which in the evening*
*Spreads its wings eagerly for the nest*

The Holy Prophet صلّ الله عليه وسلم s the only refuge for hope

Qazi

*For a sinner of my stature*
*Have I no other means left*
*Save my love for you to intercede*
*To save me from the punishment of Merciful Lord*

Iqbal

*Your slave begs not solace from anyone else*
*Life spent away from master is veritable death*
*O you who endues the Kurd with Arab's burning*
*Summon your own slave to your gracious presence*

At the doorstep of the Holy Prophet صلّ الله عليه وسلم

Qazi

*With tears flowing profusely here is Umar-*
*He stands at your doorstep; your mercy for him is dear*

Iqbal

*The shrine of your street is my refuge*
*Hopefully have I run up to you*
*Ah! The agony of my body and soul*
*A glance of yours is the sovereign remedy.*

Appeal to the mercy of the Prophet صلّ الله عليه وسلم

Qazi

*For those coming in search of mercy in your presence*
*Among those of all ages, none is greater than you in benevolence.*

Iqbal

*Your mercy on the sinners is greater*
*In forgiveness it is like mother's love.*

The praise of the Prophet صلى الله عليه وسلم as the solution for all ills of the present

Qazi

*Loving and praising the Holy Prophet صلى الله عليه وسلم are good deeds*
*It is possible that Allah may fulfill your wishes due to them.*

Iqbal

*He who cherishes love of Mustafa,*
*Controls everything in the seas and lands.*
*It is love for him that gives life*
*and prosperity in the universe to Community.*

**Contrast**

While Umar focused primarily on the jurisprudence and apparent acts of worship, Iqbal was more concerned with the zeal of faith and awakening the Ummah from their dogmatic slumber. While Umar was educated in the traditional system of religious Madrassa, Iqbal was nurtured in modern educational system including western sciences. The social and political conditions were also noticeably different in their times. While Qazi lived during the initial years of British rule, Iqbal spent his life towards the end of colonial rule.

**Conclusion**

Had Iqbal known of Qazi, he would have probably included him in his poetry just as Tipu Sultan (from South India). The gap was partly owing to the rich contributions of Keralite intelligentsia but restricted to their own mother

tongue. Umar Qazi had the courage to fearlessly challenge the British rule as well devise new method of confrontation. He critiqued the prevailing malpractices and hypocrisy of the community and made efforts to rectify them. He loved the Prophet صلى الله عليه وسلم dearly and composed several verses dedicated for the Beloved. It is impossible to assume that such a personality would not have impressed Allama Iqbal. Such assumption is only logical considering our knowledge of Iqbal' selection of the type of personalities sound in his poems. Unfortunately Fate had it otherwise. With the spread of technology and advancement of communication means, we are in a better position to remove such ignorance and thereby appreciate the universality of love for the Beloved Prophet صلى الله عليه وسلم. May this humble essay be a helping hand to bridge that gulf between the two lovers of the Prophet صلى الله عليه وسلم.

References

1. *Reconstruction of Religious Thought in Islam, by Sir Mohammed Iqbal*
2. *History of Kerala and of Her Muslims, by Dr. C.K. Kareem*
3. *Glory of Iqbal by Syed Abul Hasan Ali Nadwi*
4. *Hazrat Umar Qazi: Life and works, published by Veliyankode Mahallu Juma'th Committee*
5. *Ruzgar-i-Faqir by Faqir Wahiduddin*

# Mawlana Jalal ad-Din Rumi

## Life and Works

### Persian philosopher
### Medieval

| | |
|---|---|
| **Name:** | Jalāl ad-Dīn Muhammad Rūmī |
| **Birth:** | 1207 CE |
| **Death:** | 1273 CE |
| **School/tradition:** | Sufism; Hanafi Sunniism, possibly influenced by Shiism |
| **Main interests:** | lyric poetry, music |
| **Notable ideas:** | Middle Eastern music, Sufi poetry and Sufi philosophy |
| **Influences:** | Attar, Shams-e Tabrizi |
| **Influenced:** | Muhammad Iqbal |

### Life

Mawlānā Jalāl ad-Dīn Muhammad Rūmī(Turkish: *Mevlânâ Celâleddin Mehmed Rumi*) , also known as **Mawlānā Jalāl ad-Dīn Muhammad Balkhī** but known to the English-speaking world simply as **Rumi**, (1207–1273 CE) was a 13th century Persian (*Tājīk*) poet, jurist, and theologian. His name literally means *"Majesty of Religion"*, *Jalal* means *"majesty"* and *Din* means *"religion"*

Rumi was born in Balkh (then a city of Greater Khorasan in Persia, now part of Afghanistan) and died in Konya (in

present-day Turkey). His birthplace and native tongue indicate a Persian heritage. He also wrote his poetry in Persian and his works are widely read in Iran, Afghanistan, Tajikistan, and in translation in Turkey, Azerbaijan, the US, and South Asia. He lived most of his life and produced his works under the Seljuk Empire.

Rumi's importance is considered to transcend national and ethnic borders. Throughout the centuries he has had a significant influence on Persian as well as Urdu and Turkish literatures. His poems are widely read in the Persian speaking countries of Iran, Afghanistan and Tajikistan and have been widely translated into many of the world's languages in various formats.

After Rumi's death, his followers founded the Mevlevi Order, better known as the "Whirling Dervishes", who believe in performing their worship in the form of dance and music ceremony called the sema.

Rumi's life is described in Shams ud-Din Ahmad Aflāki's *"Manākib ul-Ārifīn"* (written between 1318 and 1353). He is described as a descendant of the caliph Abu Bakr, and of the Khwārizm-Shāh Sultān Alā ud-Dīn bin Takash (1199–1220), whose only daughter, Mālika-e Jahān, had allegedly been married to Rumi's grandfather. However, both claims are rejected by modern scholars.

When the Mongols invaded Central Asia sometime between 1215 and 1220, his father (Bahauddin Walad, a theologian, jurist and a mystic of uncertain lineage) set out westwards with his whole family and a group of disciples. On the road to Anatolia, Rumi encountered one of the most

famous mystic Persian poets, Attar, in the city of Nishapur, located in what is now the Iranian province of Khorāsān. Attar immediately recognized Rumi's spiritual eminence. He saw the father walking ahead of the son and said, "Here comes a sea followed by an ocean." He gave the boy his *Asrarnama*, a book about the entanglement of the soul in the material world. This meeting had a deep impact on the eighteen-year-old Rumi's thoughts, which later on became the inspiration for Rumi's works.

From Nishapur, Walad and his entourage set out for Baghdad, meeting many of the scholars and Sufis of the city. From there they went to the Hejaz and performed the pilgrimage at Mecca. It was after this journey that most likely as a result of the invitation of Allāh ud-Dīn Key-Qobād, ruler of Anatolia, Bahauddin came to Asia Minor and finally settled in Konya in Anatolia within the westernmost territories of Seljuk Empire.

Bahauddin became the head of a madrassa (religious school) and when he died Rumi succeeded him at the age of twenty-five. One of Bahauddin's students, Syed Burhanuddin Mahaqqiq, continued to train Rumi in the religious and mystical doctrines of Rumi's father. For nine years, Rumi practiced Sufism as a disciple of Burhanuddin until the latter died in 1240-1. During this period Rumi also travelled to Damascus and is said to have spent four years there.

It was his meeting with the dervish Shams Tabrizi in the late fall of 1244 that changed his life completely. Shams had traveled throughout the Middle East searching and praying for someone who could "endure my company". A

voice came, "What will you give in return?" "My head!" "The one you seek is Jelaluddin of Konya." On the night of December 5, 1248, as Rumi and Shams were talking, Shams was called to the back door. He went out, never to be seen again. It is believed that he was murdered with the connivance of Rumi's son, Allaedin; if so, Shams indeed gave his head for the privilege of mystical friendship.

Rumi's love and his bereavement for the death of Shams found their expression in an outpouring of music, dance and lyric poems, Divani Shamsi Tabrizi. He himself went out searching for Shams and journeyed again to Damascus. There, he realized:

*Why should I seek? I am the same as*
*He. His essence speaks through me.*
*I have been looking for myself!*

For more than ten years after meeting Shams, Mevlana had been spontaneously composing ghazals, and these had been collected in the *Divan-i Kabir*. Rumi found another companion in Saladin Zarkub, the goldsmith. After Saladin's death, Rumi's scribe and favorite student Husam Chelebi assumed the role. One day, the two of them were wandering through the Meram vineyards outside of Konya when Husam described an idea he had to Rumi: "If you were to write a book like the Ilahiname of Sanai or the Mantik'ut-Tayr'i of Attar it would become the companion of many troubadours. They would fill their hearts from your work and compose music to accompany it."

Rumi smiled and took out a piece of paper on which were written the opening eighteen lines of his Mathnawi, beginning with:

> *Listen to the reed and the tale it tells,*
> *How it sings of separation...*

Husam implored Rumi to write more. Rumi spent the next twelve years of his life in Anatolia dictating the six volumes of this masterwork, the *Mathnawi* to Husam. In December 1273, Rumi fell ill; he predicted his own death and composed the well-known ghazal, which begins with the verse:

> *How doest thou know what sort of king I have within me as companion?*
> *Do not cast thy glance upon my golden face, for I have iron legs.*

He died on December 17, 1273 in Konya; Rumi was laid to rest beside his father, and a splendid shrine, the *Yeşil Türbe* "Green Tomb"(original name: ءارزخلا هبق), was erected over his tomb. His epitaph reads:

> *"When we are dead, seek not our tomb in the earth, but find it in the hearts of men."*

**Teachings of Rumi**

The general theme of his thoughts, like that of the other mystic and Sufi poets of the Persian literature, is essentially about the concept of Tawheed (unity) and union with his

beloved (the primal root) from which/whom he has been cut and fallen aloof, and his longing and desire for reunity.

The "Mathnawi" weaves fables, scenes from everyday life, Qur'anic revelations and exegesis, and metaphysics, into a vast and intricate tapestry. Rumi is considered an example of "*ensaneh kaamel*" — the perfected or completed human being. In the East, it is said of him, that he was, "not a prophet — but surely, he has brought a scripture". Rumi believed passionately in the use of music, poetry and dancing as a path for reaching God. For Rumi, music helped devotees to focus their whole being on the divine, and to do this so intensely that the soul was both destroyed and resurrected. It was from these ideas that the practice of Whirling Dervishes developed into a ritual form. He founded the order of the Mevlevi, the "whirling" dervishes, and created the "Sema", their "turning", sacred dance. In the Mevlevi tradition, Sema represents a mystical journey of spiritual ascent through mind and love to "Perfect." In this journey the seeker symbolically turns towards the truth, grows through love, abandons the ego, finds the truth, and arrives at the "Perfect", then returns from this spiritual journey with greater maturity, so as to love and to be of service to the whole of creation without discrimination against beliefs, races, classes and nations.

According to Shahram Shiva, one reason for Rumi's popularity is that "Rumi is able to verbalize the highly personal and often confusing world of personal/spiritual growth and mysticism in a very forward and direct fashion. He does not offend anyone, and he includes everyone. The world of Rumi is neither exclusively the world of a Sufi, nor the world of a Hindu, nor a Jew, nor a Christian; it is

the highest state of a human being — a fully evolved human. A complete human is not bound by cultural limitations; he touches every one of us. Today Rumi's poems can be heard in churches, synagogues, Zen monasteries, as well as in the downtown New York art/performance/music scene." According to Professor Majid M. Naini, Rumi's life and transformation provide true testimony and proof that people of all religions and backgrounds can live together in peace and harmony. Rumi's visions, words, and life teach us how to reach inner peace and happiness so we can finally stop the continual stream of hostility and hatred and achieve true global peace and harmony.

In other verses in Mathnavi, Rumi describes in detail the universal message of love:

*Love 's nationality is separate from all other religions.*
*The lover 's religion and nationality is the Beloved (God).*
*The lover 's cause is separate from all other causes*
*Love is the astrolabe of God 's mysteries.*

**Major works**

Rumi's poetry is often divided into various categories: the quatrains (*rubaiyat*) and odes (*ghazals*) of the Divan, the six books of the Mathnavi, the discourses, the letters, and the almost unknown *Six Sermons*. Rumi's major work is ***Masnavi-ye Manavi*** (Spiritual Couplets), a six-volume poem regarded by many Sufis as second in importance only to the Qur'an. In fact, the Masnavi is often called the "*Qur'an-e Parsi*" (The Persian Qur'an). It is considered by many to be one of the greatest works of mystical poetry.

Rumi's other major work is the ***Divan-e Shams-e Tabriz-i*** (The Works of Shams of Tabriz - named in honor of Rumi's great friend and inspiration, the darvish Shams), com ising some 40,000 verses. Several reasons have been offered for Rumi's decision to name his masterpiece after Shams. Some argue that since Rumi would not have been a poet without Shams, it is apt that the collection be named after him. Others have suggested that at the end, Rumi became Shams, hence the collection is truly of Shams speaking through Rumi. Both works are among the most significant in all of Persian literature. Shams is believed to have been murdered by disciples of Rumi who were jealous of his relationship with Shams (also spelled Shems).

***Fihi Ma Fih*** (*In It What's in It*) is composed of Rumi's speeches on different subjects. Rumi himself did not prepare or write these discourses. They were recorded by his son *Sultan Valad* or some other disciple of Rumi and put together as a book. The title may mean, "What's in the Mathnavi is in this too." Some of the discourses are addressed to *Muin al-Din Parvane*. Some portions of it are commentary on Masnavi.

***Majalis-i Sab'a*** (seven sessions) contains seven sermons (as the name implies) given in seven different assemblies. As *Aflaki* relates, after *Sham-i Tabrizi*, Rumi gave sermons at the request of notables, especially *Salah al-Din Zarqubi*.

**Legacy**

Rumi's importance transcends national and ethnic borders. Speakers of the Persian language in Iran, Afghanistan and Tajikistan see him as one of their most significant classical

poets and an influence on many poets through history. He has also had a great influence on Turkish literature throughout the centuries. His poetry forms the basis of much classical Iranian and Afghan music. Contemporary classical interpretations of his poetry are made by Muhammad Reza Shajarian (Iran), Shahram Nazeri (Iran), Davood Azad (Iran) an Ustad Mohammad Hashem Cheshti (Afghanistan). To many modern Westerners, his teachings are one of the best introductions to the philosophy and practice of Sufism. Pakistan's National Poet, Muhammad Iqbal (November 9, 1877-April 21, 1938) was also inspired by Rumi's works and considered him to be his spiritual leader and addressed him as *Pir Rumi* in his poems (the honorific Pir literally means *old man*, but in the sufi/mystic context it means *founder*, *master*, or *guide*).

Rumi's work has been translated into many of the world's languages including Russian, German, Urdu, Turkish, Arabic, French, Italian and Spanish. The English translations of Rumi's poetry by Coleman Barks have sold more than a half million copies worldwide. Recordings of Rumi poems have made it to Billboard's Top 20 list.

**The Mevlevi Order**

The Mevlevi Sufi order was founded in 1273 by Rumi's followers after his death.His first successor in the rectorship of the order was Husam Chelebi himself, after whose death in 1284 Rumi's younger and only surviving son, Sultan Walad, favorably known as author of the mystical Mathnawi Rabābnāma, or the Book of the Guitar (died 1312), was installed as grand master of the order. The leadership of the order has been kept in Jalaluddin's family

in Iconium uninterruptedly for the last six hundred years. The Mevlevi, or "The Whirling Dervishes", believe in performing their dhikr in the form of sema. During the time of Rumi (as attested in the "Manakib ul Arifin" of Eflaki Dede), his followers gathered for musical and "turning" practices. Mevlana himself was a notable musician, who played the rebab although his favorite instrument was the ney. The music accompanying the traditional ritual consists of settings of poems from the "Mathnawi" and "Diwan-i-Kebir" or of his son Sultan Veled's poems. The Mevlevi were a well-established Sufi Order in the Ottoman Empire, and many of the members of the order served in various official positions of the Caliphate. The centre for the Mevlevi order was in Konya. There is also a Mevlevi monastery or dergah in Istanbul, near the Galata Tower, where the sema ceremony is performed and accessible to the public. The Mevlevi order issues an invitation to people of all backgrounds:

> "*Come, come, whoever you are,*
> *Wanderer, idolater,*
> *worshipper of fire,*
> *Come even though you have broken your vows a thousand times,*
> *Come, and come yet again.*
> *Ours is not a caravan of despair.*"

During Ottoman times, the Mevlevi order produced a number of famous poets and musicians such as Sheikh Ghalib, Ismail Rusuhi Dede of Ankara, Esrar Dede, Halet Efendi, and

Gavsi Dede (all buried at the Galata Mevlevi-Hane in Istanbul) and the poet Sari Abdullah. Music, especially the ney, play an important part in the Mevlevi order and thus much of the traditional 'oriental' music that Westerners associate with Turkey originates with the Mevlevi order. Indeed, if one buys a CD of Turkish Sufi music, chances are it will be Mevlevi religious music.

The Mevlevi order was outlawed in Turkey at the dawn of the secular revolution by Kemal Atatürk in 1923. In the 1950s, the Turkish government began allowing the Whirling Dervishes to perform annually in Konya on the Urs of Mevlana, December 17, the anniversary of Rumi's death. In 1974, they were allowed to come to the West. The Mevlana annual festival is held every year in Konya in December. It lasts two weeks and its culminating point is the 17th December called *Sheb-i Arus* meaning 'Nuptial Night', the night of the union of Mevlana with God.

Source:
http://en.wikipedia.org/wiki/
Jalal_ad-Din_Muhammad_Rumi

Kabir Helminski

# Our Master Jalaluddin (Rumi)

Who is this Rumi who has become one of the most popular voices on the contemporary literary and spiritual scene? Why does he speak so compellingly to our sensibilities at this time? What need does he fill? What wound does he help to heal? How is it that a thirteenth-century Islamic saint should become the darling of so many who profess an interest in neither poetry nor spiritual discipline? In the mosques, in academia, in the cafes, and in the studios of Hollywood people are reading and, moreover, *quoting* Rumi.

There is no doubt that he is one of the great literary figures of all time. Within Islamic cultures, especially from the Balkans, through Turkey, Iran, to Pakistan and India, he is deeply loved. His works include s massive collection of lyric poems (*ghazals* and *rubaiyat*) as well as the six-volume *Mathnavi*, a collection of rhymed couplets that weaves together a rich fabric of stories, humor, and spiritual teaching.

The pivotal event in Rumi's live was his meeting with an enigmatic, peripatetic saint named Shamsi Tabrizi. Their encounter somehow kindled a creative and spiritual fire in Rumi that burned for the rest of his life. Rumi saw a reflection of the Divine in Shams; through this relationship, Rumi experienced the Divine with an unprecedented power. In some of Rumi's more ecstatic verses the boundaries between the Divine and the human are blurred. Yet Sufis have always maintained a fastidious distinction

between the servant (the human being) and Lord (the Divine). In the mysticism of Islam there is no room for idolatry, material or human.

It is a poetic tradition, especially in the odes and quatrains, to push the metaphors of sensual love and intoxication to their limits, for nothing else can convey the overwhelming nature of the encounter with the Divine. In our Western literary tradition we have not been prepared for this union of the sensual and the spiritual. Our own cultural history has bifurcated: religion in one direction and literature in another. The division was much less pronounced within Islam – in fact, it was practically nonexistent. The Sufis, especially, were neither puritanical nor sensually indulgent. They followed the middle way of Muhammad, which included marriage, a socially useful livelihood, and a life "in the world but not of it".

In Rumi we have a model of the potential harmony between the physical and the spiritual, the heart and the mind, the finite and the Infinite, the human the Divine. Rumi was not a narrow, "religious" personality, nor was he a proponent of some form of mystical eroticism, nor was he a Promethean rebel. It would surprise many that this passionate and ecstatic man of God made a living during his entire life partly through legal consultations within the framework of Islamic law. He prayed and fasted as any Muslim would, but he challenged the hypocritical and one dimensional "religion" that is always the enemy of real spirituality.

Maulana Jalaluddin Rumi penetrated to the heart of Reality and returned with the fragrance and flavour of Truth. Not

only is he one of the greatest literary geniuses, but, perhaps more importantly, he also addresses the most important subject that can be addressed: the human being's relationship with the Divine, with Truth itself. While entertaining, inspiring, informing and subtly guiding us, Rumi's words touch us at the level where we most need to be touched: the very depth of our hearts.

In doing so, Rumi never places himself in an exalted position in relation to his readers. He is human being like us, though perhaps more patient, more humble, more forgiving, more flexible than most. This is another aspect of his greatness: that there was no discrepancy between his words and his life.

His humanness and his approachability, however, may mislead us if it causes us to reduce his thought to our own level. Yet we can only begin where we are,, and everyone he takes from Maulana what she or he can. Our culture, I am sure, is only beginning to understaind what is contained in Rumi, and the challenge we face is to be able to map his insight and wisdom to our own human experience.

Reference : Shambhala, London 2001, The Pocket Rumi Reader

# "IQBAL REVIEW"

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

April 2007

Special Issue
on the occasion of
800th year Birth Anniversary of
**MOULANA JALALUDDIN RUMI**

**IQBAL ACADEMY**
Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank,Hyderabad-28, A.P., INDIA

**ISBN. 81-86370-34-1**